رمضان کی قدر افزائی

ہر سال کی طرح اس دفعہ بھی اللہ تعالیٰ نے ہمیں رمضان المبارک کا مہینا عطا فرمایا ہے۔ مقامِ فکر یہ ہے کہ کیا ہم نے اس مہینے کی قدر کی ہے؟ کیا ہماری زندگی میں یہ بابرکت مہینا انقلاب پیدا کرسکا یا ہم اپنی اسی پرانی روش پر چل رہے ہیں جس پر چلتے ہوئے سال کے باقی گیارہ مہینے گزار دیتے ہیں۔

اس مہینے کی قدر افزائی اس کے علاوہ ممکن ہی نہیں کہ ہم اس کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے خود کو تقوے کی اس روشن شاہراہ پر گامزن کردیں جس کی تلقین قرآنِ مجید میں جابجا کی گئی ہے تاکہ روزے جیسی عبادت بجالانے میں بھی ایک مقصدیت پیدا ہوجائے اور وہ ہے تقوے کا حصول! جب مسلمان کسی مقصد کے لیے سعی شروع کرتا ہے تو اللہ کی مدد بھی شاملِ حال ہوجاتی ہے، اس لیے ہمیں اولین تبدیلی خود میں یہ لانی ہوگی کہ ہم اس مہینے کی مخصوص عبادات کی بجاآوری کے سلسلے میں صرف بھوک پیاس برداشت کرنے اور محض تھکاوٹ کو جھیلنے کی بجائے ساتھ ساتھ اس عبادت کی غرض پر نظر رکھیں، ان شاءاللہ یہ پہلا کامیاب قدم ہوگا ہمارا اپنی اصلاح کی طرف، وباللہ التوفیق۔

کھجور، رمضان کا خاص تحفہ

غذا ہمارے جسم و جان کے لیے ایک ضروری چیز اور چراغِ حیات کا تیل ہے۔ تندرست و توانا جسم اچھی خوراک کا مرہون منت ہے کیوں کہ جہادِ زندگی میں زائل شدہ قوتوں کی بازیابی اور نشو ونما کے لیے اچھی غذا ہی بدل کا کام دیتی ہے اور یہی ہمارے اعضاء کی پوری طرح نشو ونما کر کے اسے درجہ کمال تک پہنچاتی ہے۔ خالق ارض وسما نے انسان کی اس بہترین جسمانی عمارت کو شکست وریخت سے بچانے کے لیے اپنی خاص نعمتوں سے نوازا ہے۔ انھی میں سے ایک کھجور بھی ہے۔ کھجور کو غذائی قوت بخشنے میں قدرت نے بہت ہی فراخ دلی سے کام لیا ہے، جس قدر قوت بخش اجزاء اس پھل میں موجود ہیں وہ کسی اور پھل میں نہیں۔ کھجور کی اہمیت کے لیے یہی بات کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں اس کا ذکر اچھے پیرائے میں کیا ہے۔ متعدد احادیث میں اس کے استعمال پر زور دیا گیا ہے۔ مثال کی طور پر کھجور سے روزہ کھولنا دوسری اشیاء کے استعمال کی نسبت افضل قرار دیا گیا ہے مزید برآں اسے حضور ﷺ کے پسندیدہ پھل ہونے کا شرف حاصل ہے۔

تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ کھجور دنیا کا قدیم ترین پھل ہے۔ تاریخ اور آثارِ قدیمہ کے جدید ترین ماہرین نے سو میری قوم (قدیم عراق کے باشندے) اور مصر کے بعض کھنڈرات کی کھدائی کرنے کے بعد جو آثار قدیمہ دریافت کیے ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ قدیم مصر و عراق کے باشندے اپنے گھروں کی چھتوں میں کھجور کے تنکے اور شاخیں استعمال کرتے تھے۔ برصغیر پاک و ہند میں اس پھل کی آمد اور پیداوار کے ارتقائی مراحل کے متعلق معلومات ناپید ہیں۔ تاہم بعض محققین کا خیال ہے کہ کھجور کا پودا زمانہ قدیم ہی سے برصغیر پاک و ہند میں موجود تھا۔ خیال ہے کہ یہ درخت خلیج فارس کے نواحی علاقوں، مثلاً: ایران، عراق، عرب اور شمالی افریقا سے چل کر دوسرے ملکوں میں لایا گیا مگر اس پھل نے سرزمین عراق میں ہی ترقی پائی اور اب تک اسی خطے میں کھجور کا عمدہ پھل بہ افراط ہوتا ہے۔

اس عظیم اور متبرک پھل کو گرم آب وہوا راس آئی اور اسی لحاظ سے اس نے گرم خطے میں جنم لیا۔ یہی وہ رمضان المبارک کا مہمان میوہ ہے جو نبی کریم ﷺ کا مرغوب ترین پھل تھا اور آپ اسی سے افطاری فرماتے تھے۔ کھجور اپنے قد وقامت کے لحاظ سے مختلف قسموں میں پائی جاتی ہے۔ اس کی ایک قسم بغیر گٹھلی کے بھی ہے جو سرزمین مدینہ کے علاوہ اور کہیں نہیں ملتی۔ غذائیت کے لحاظ سے کھجور میں وٹامن کی وافر تعداد موجود ہے جو جسم کے نشو ونما اور پرورش کے لیے ضروری ہے۔ ان تمام اجزاء کی موجودگی نے کھجور کو انسانی جسم کی تندرستی کے لیے ایک اہم پھل کا درجہ عطا کیا ہے۔ اس میں شکر کی کافی مقدار موجود ہے جو نظام ہضم کی درستی کے لیے اکسیر ہے۔ نشاستہ، چربی اور گوند کی موجودگی کے باعث کھجور دورانِ خون، نمکیات اور قوت میں اضافہ کے لیے بہترین پھل ہے۔ مزاج کے لحاظ سے گرم تر ہے۔ مقوی اور کثیر الغذا ہے۔ خون صالح پیدا کرتی ہے۔ ہر قسم کے اندرونی اور بیرونی ورموں کو تحلیل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، بلغم کو خارج کرتی ہے اور پتھری کو توڑتی ہے۔ زود ہضم ہے۔ گردے اور کمر کو طاقت دیتی ہے۔ درحقیقت اسے دوسرے لفظوں میں خون کا قدرتی بنک کہنا بے جا نہ ہوگا۔ (حکیم عبدالرحمٰن خان نصر)



بسم اللہ الرحمن الرحیم

واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا

بانی: مولانا محمد عطاء اللہ حنیف رحمہ اللہ

سرپرست: مولانا ابوبکر صدیق السلفی

مسلک اہلحدیث کا داعی و ترجمان

ہفت روزہ

الاعتصام

لاہور

یکے از مطبوعات دار الدعوۃ السلفیة

21 رمضان المبارک 1433ھ جمعة المبارک 10 تا 16 اگست 2012ء

شمارہ 32 جلد 64

خط کتابت کے لیے	:	ہفت روزہ الاعتصام، 31 شیش محل روڈ، لاہور
کرنٹ اکاؤنٹ نمبر	:	ABL 2466-4 بلال گنج برانچ لاہور
فون نمبر	:	042-3735 4406
فیکس نمبر	:	042-37229802
رجسٹرڈ نمبر	:	CPL : 12

E-Mail: al.aitisam@gmail.com

بدل اشتراک

فی پرچہ	:	-/12 روپے
سالانہ	:	-/500 روپے
بیرونی ممالک سے	:	-/200 ریال
		-/60 ڈالر امریکی

پرنٹر: پرنٹ یارڈ پرنٹرز، لاہور۔ ناشر: حافظ احمد شاکر، مقام اشاعت: 31 شیش محل روڈ لاہور 54000

اداریہ

حیاتِ طیبہ

ملک عصمت اللہ

انسان کی زندگی مختلف ادوار سے گزرتی ہوئی انجام کو بڑھتی ہے۔ پہلے دور میں اس کا مقصدوحید کھانا پینا ہوتا ہے۔ بچہ پیدا ہوتے ہی بھوک سے بلکتا ہے تو ماں اسے اس کی غذا (دودھ) مہیا کرتی ہے۔ اس کی دوسری ضرورت لباس ہے جو اسے موسم کی سختی نرمی سے محفوظ رکھتا ہے۔ ذرا شعور آتا ہے تو اسے ہم جولیوں کی تلاش ہوتی ہے تا کہ ان سے مل کر کھیلے۔ وہ جانوروں کی طرح بھٹوں، غاروں اور گھونسلوں میں نہیں رہ سکتا لہٰذا اسے رہائش کے لیے مکان چاہیے۔ یہی چار چیزیں ......روٹی، کپڑا، مکان اور معاشرہ......اس کی بنیادی ضروریات اور اس کی زندگی کا مادہ ہیں۔ زندگی کا یہ دور جس میں کھانا پینا، رہنا سہنا ہی زندگی کا مقصد ٹھہرے حیوانی زندگی کا دور ہے۔

عقل مزید بڑھی اور شعور آیا تو اس نے پہلے دور میں مداخلت کر کے اس میں حسن و جمال پیدا کر لیا۔ اچھے کھانے، رنگ برنگ عمدہ لباس خوب صورت مکان عالی شان محل اور بنگلے بنائے لیکن اس کی بنیادی ضروریات وہی رہیں۔ اگر فرق پڑا تو یہ کہ طبیعت کھانا چاہتی تھی تو عقل نے سو طرح کی اشیاء تیار کر لیں۔ طبیعت چاہتی تھی کہ کوئی ہم جولی ملے، عقل چاہتی تھی کہ بات کریں تو لہجہ شائستہ ہو، گفتگو کا انداز مہذبانہ ہو۔ اٹھنے بیٹھنے کا ڈھنگ بھی اچھا ہو۔ عقل یہ بھی چاہتی ہے کہ کوئی اکیلا نہ کھائے سب مل جل کر کھائیں تو عقل نے اجتماعی زندگی سکھا دی۔ اس تبدیلی کو انسانی زندگی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ مگر اس کا مادہ بھی وہی تھا جو حیوانی زندگی کا تھا۔ حیوانی زندگی میں یہ مادہ خود غرضی کے لیے استعمال ہوتا تھا اب عقل کے تحت ساری بنی نوعِ انسان کا فائدہ پہنچنے لگا۔

انسانی زندگی اس سے بھی آگے بڑھتی ہے۔ طبیعت کھانے پینے میں محض نفس کی رضا چاہتی تھی، جب عقل آ گئی تو بنی نوعِ انسان کی رضا بھی سامنے آ گئی۔ اگر کسی کے اندر ان تمام افعال میں یہ چیز بھی پیش نظر ہو جائے کہ تنہا میں راضی نہ ہوں، نہ تنہا معاشرہ راضی ہو بلکہ اس سے میرا اللہ بھی راضی ہو۔ وہ کھاؤں جو اسے پسند ہو۔ لباس پہنوں تو وہ پہنوں جس سے میرا رب راضی ہو۔ ریشم کا کپڑا پہننا حرام ہے۔ اس سے نفس اور لوگ تو راضی ہو جائیں گے کہ بڑا عمدہ لباس پہنا ہے مگر اللہ راضی نہیں ہوگا۔ ایمان یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ کون سا لباس جائز ہے اور کون سا ناجائز، کون سا حلال ہے اور کون سا حرام؟

اس طرح کھانا کھانے بیٹھے تو آدمی غور کرے گا کہ دستر خوان پر موجود گوشت حرام گوشت تو نہیں۔ وہ حرام چیز سے اس طرح بھاگے گا جیسے سنکھیا سے بھاگتا ہے۔ سینکھیا مادی موت کا سبب ہے تو حرام کھانا روحانی موت کا سبب ہے۔ عقل حرام کھانے سے منع نہیں کرے گی مگر ایمان اس کے کھانے کی اجازت نہیں دے گا اور وہ پروردگار کی رضا کو ہر چیز پر ترجیح دے گا یہ ایمانی زندگی ہوگی۔

ایمانی زندگی کے اندر وہی تمام چیزیں ہیں جو اب تک استعمال میں آ رہی تھیں لیکن صرف شکل بدل گئی وہی کھانا پینا، وہی سونا جاگنا وہی اٹھنا بیٹھنا۔ ان افعال پر نفس کی حکمرانی تھی تو حیوانی زندگی بنی، عقل حکومت کرنے لگی تو انسانی زندگی بنی اور خدا کی وحی حکومت کرنے لگی تو ایمانی زندگی بنی۔ ایمان نے انسانی زندگی کا جو مادہ تھا اسے شائستہ اور بہتر بنا دیا اور اس کا رخ دین کی طرف موڑ دیا۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((التقوی ھھنا واشار الی صدرہ)) کہ تقویٰ دل میں ہوتا ہے۔ تقویٰ جب دل کے اندر آئے گا تب عمل میں پیدا ہوگا۔ جب تقویٰ قلب میں نہیں ہوگا تو قالب میں بھی نہیں ہوگا۔ جب ایمانی زندگی آتی ہے تو دل میں پیدا ہونے والے خیالات کو بھی کنٹرول کرنا ہوگا کیوں کہ اللہ دلوں کو بھی دیکھتے ہیں۔ ﴿ان اللہ لا ینظر الی صور کم ولکن ینظر الی قلوبکم﴾ کہ اللہ تمھاری صورتیں نہیں دیکھتا بلکہ دلوں کو دیکھتا ہے کہ اس کے اندر نیت کیا ہے؟

جو کام انسان کرتا ہے وہی ہر کوئی کرتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ مومن تمام کام لوجہ اللہ کرے گا، کافر وہی کام اپنے نفس کو خوش کرنے کے لیے کرے گا۔ عمل میں فرق نہیں ہوتا بلکہ نیت اور روح میں فرق ہوتا ہے۔ ایک کا رخ زمین کی طرف ہے اور دوسرے کا رخ عرش کی طرف۔ ایمانی زندگی اعمال کو تبدیل نہیں کرتی بلکہ اس کا رخ بدلتی ہے اور عام حالات میں یہ زندگی مطلوب بھی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اسلم کہہ کہ مطیع وفرماں بردار بننے کا حکم دیا اور حکم دیا کہ اپنے آپ کو ہمارے حوالے کردو تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسلمت لرب العالمین کہہ کر اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دیا اور کہا کہ پوری طرح مطیع وفرماں بردار بن گیا تو فرمایا، اعلان کردو:

﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ o لَا شَرِیْكَ لَهٗ وَ بِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ o﴾

[الأنعام: ١٦٢،١٦٣]

''کہ میری نماز، میری قربانی، میرا جینا مرنا سب اللہ رب العالمین کے لیے ہے جس کا کوئی شریک نہیں کہ میں ان اعمال میں کسی کو شریک نہیں کرتا محض اللہ کی رضا کے لیے کرتا ہوں۔''

مسلم بننے کے معنی یہی ہیں کہ کھانا پینا اور مرنا جینا سب لوجہ اللہ بن جائے۔

جب ایمانی زندگی پایہ تکمیل کو پہنچ جاتی ہے تو اس کے بعد عرفان کی زندگی شروع ہوتی ہے کہ انسان قانون کی پابندی کرتے کرتے قانون ساز کی منشاء کی پابندی کرنے لگتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اپنے مالوں میں سے کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کرو تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنا پورا مال اللہ کی راہ میں لٹا دیا۔ قانون تو اتنا ہی تھا کہ ''کچھ'' خرچ کرو لیکن سارا مال لٹا دینا ہی ان کا عرفان تھا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کئی کئی روز آگ نہ جلتی، بس چند کھجوروں اور پانی پر گزارا ہوتا۔ یہ حکم یا قانون کہیں نہیں تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فاقہ کشی کریں لیکن قانون ساز کا منشا آپ کے قلب مبارک پر روشن تھا۔ انبیاء کی پاکیزہ زندگی کا یہی تقاضا تھا کہ وہ کھانے پینے اور لذات دنیا کی طرف توجہ نہ دیں بلکہ حق تعالیٰ کی طرف توجہ رکھیں۔ قانون ساز کی منشا کو پا کر اس پر عمل کرنا ہی عرفان ہے۔ عرفانی زندگی کا مادہ بھی وہی تھا جو حیوانی زندگی کا تھا۔ وہی کھانا پینا، وہی رہنا سہنا، وہی سب کچھ لیکن منشاء خداوندی حاکم بن گیا۔ ساری دنیا موجود ہے مگر خط نفس کا کوئی گذر نہیں۔ نفسانیت کا کوئی شائبہ نہیں۔ للّٰہیت کے جذبات کام کرتے ہیں۔ دوستی اور دشمنی سب اللہ کے لیے ہوتی ہے۔ من اعطی للہ ومنع للہ فاحب للہ وابغض للہ فقد استکمل الایمان ۔ جس نے محبت کی اللہ کے لیے، دشمنی کی اللہ کے لیے، کسی کو کچھ دیا تو اللہ کے لیے اور ہاتھ روکا تو اللہ کے لیے تو اس نے اپنا ایمان مکمل کر لیا۔

اس معرفت کے بعد زندگی مزید آگے چلتی ہے۔ حدیث میں آتا ہے:

لا یزال یتقرب عبدی بالنوافل حتی کنت سمعه الذی اسمع به وبصره الذی یبصر به ویده التی یبطش بها .

کہ بندہ نوافل پڑھتے پڑھتے مجھ سے اتنا قریب ہو جاتا ہے کہ میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں جن سے وہ پکڑتا ہے۔ یعنی ظاہری اعضاء اس کے ہوتے ہیں اور قوتیں میری کام کرتی ہیں، جو میری چاہت ہوتی ہے وہی اس کی چاہت ہوتی ہے۔ وما تشاؤن الا أن یشاء الله .

جب انسان اپنی چاہت اس کی چاہت میں گم کر دے اور ہر طور راضی برضا ہو جائے تو وہ اللہ کا محبوب بن جاتا ہے، پھر جبرائیل علیہ السلام کو کہا جاتا ہے کہ آسمان والوں میں اعلان کر دیں کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں تم بھی اس سے محبت کرو۔ پھر اس کی محبت دنیا میں اتاری جاتی ہے کہ اہل دنیا بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ اس طرح محبوب خالق محبوب خلائق بن جاتا ہے اور انھیں شہرت دوام بخش دی جاتی ہے اور لوگ انھیں صدیوں یاد رکھتے ہیں۔ پھر نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ اگر کوئی اس سے دشمنی کرے تو اللہ تعالیٰ خود اس کی طرف سے اس کے دشمن کے ساتھ آمادہ بہ جنگ ہو جاتے ہیں۔ ان اللہ قال من عادی لی ولیا فقد اذنته بحرب یعنی جو میرے دوست کے ساتھ دشمنی کرے گا میں اس کے ساتھ اعلان جنگ کرتا ہوں۔ یہی وہ حیات طیبہ ہے جس کا وعدہ قرآن میں دیا گیا ہے:

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْیِیَنَّهٗ حَیٰوةً طَیِّبَةً وَ لَنَجْزِیَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ o﴾

[النحل: ٩٧]

درس قرآن — قسط نمبر ۳۵

تفسیر سورۂ یٰس

مولانا ارشاد الحق اثری حفظہ اللہ

﴿وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ o وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰی عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِیْمِ o لَا الشَّمْسُ یَنْۢبَغِیْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّیْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ o﴾

[یٰس: ۳۸-۴۰]

''اور سورج اپنے ایک ٹھکانے کے لیے چل رہا ہے، یہ اس سب پر غالب، سب کچھ جاننے والے کا اندازہ ہے۔ اور چاند، ہم نے اس کی منزلیں مقرر کردیں یہاں تک کہ وہ دوبارہ پرانی (کھجور کی) ٹیڑھی ڈنڈی کی طرح ہوجاتا ہے۔ نہ سورج، اس کے لیے لائق ہے کہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات ہی دن سے پہلے آنے والی ہے اور سب ایک ایک دائرے میں تیر رہے ہیں۔''

رات دن کا انقلاب شمس وقمر کے آنے جانے سے وابستہ ہے، اس لیے اب اسی حوالے سے دونوں کا ذکر ہے۔

﴿وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا﴾ ''اور سوج اپنے ایک ٹھکانے کے لیے چل رہا ہے۔'' عینی مشاہدے کی بنا پر زمانۂ قدیم سے یہ تصور پایا جاتا ہے کہ سورج زمین کے گرد چکر لگا رہا ہے۔ سائنس دان ایک دور میں سورج کے چلنے کا انکار کرتے تھے مگر اب تسلیم کرتے ہیں کہ وہ اپنے پورے نظام کے ساتھ بیس کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے حرکت کررہا ہے۔

﴿تَجْرِیْ﴾ یہ الجریٰ سے ہے جس کے معنی تیزی سے چلنے کے ہیں۔ (مفردات)

سورج کی اس تیزی کے بارے میں یہ اندازہ سائنس دانوں کا ہے، حقیقی رفتار تو اللہ تعالیٰ کو ہی معلوم ہے۔ سورج کے حجم اور فوائد کی بنا پر عموماً اس کا ذکر چاند سے پہلے ہوا ہے۔

﴿مُسْتَقَرٍّ﴾ یعنی ٹھکانے سے مراد اس کی جائے قرار ہے اور وہ عرش کے نیچے کی سمت ہے جو بہ جانب زمین ہے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے اسی آیت ﴿وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا﴾ کے بارے میں سوال کیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مستقرها تحت العرش .))

(صحيح بخاري، رقم الحديث: ۴۸۰۲)

''اس کا مستقر عرش کے نیچے ہے۔''

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ مزید فرماتے ہیں کہ میں غروبِ آفتاب کے وقت رسول اللہ ﷺ کے پاس تھا، آپ ﷺ نے فرمایا:

((يا أبا ذر! أتدري أين تغرب الشمس؟))

قلت: الله ورسوله أعلم، قال: ((فإنها تذهب حتى تسجد تحت العرش فذلك قوله تعالى: وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا))

(صحيح بخاري، رقم الحديث: ۴۸۰۱)

''اے ابوذر! کیا تمھیں معلوم ہے کہ سورج کہاں غروب ہوتا ہے؟'' میں نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول ہی خوب جانتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ چلتا ہے حتی کہ عرش کے نیچے سجدہ کرتا ہے، ﴿وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا﴾ کا یہی مفہوم ہے۔''

بلکہ صحیح بخاری ہی میں یہ بھی ہے کہ سورج چلتا ہے تا آنکہ وہ رب

تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز ہوتا اور واپسی کی اجازت طلب کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے اجازت عطا فرماتے ہیں تو وہ اپنے مستقر سے طلوع ہوتا ہے۔ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے اسی مضمون کی حدیث میں ہے کہ روزانہ سورج عرش کے نیچے سجدہ کرتا ہے اور طلوع کے لیے اجازت طلب کرتا ہے، اجازت پا کر نیا دور شروع کر دیتا ہے یہاں تک کہ ایک دن ایسا آئے گا کہ وہ دوسرے دور کی اجازت طلب کرے گا مگر اسے اجازت نہیں ملے گی بلکہ اسے حکم ہوگا کہ جس جانب سے آئے ہو اسی جانب پلٹ جاؤ۔ یہ قربِ قیامت کی علامت ہوگی اور اس کے بعد قیامت کے دن تک جو ایمان لائے گا اس کا ایمان معتبر نہیں ہوگا اور اس کا ایمان اسے کوئی فائدہ نہیں دے گا۔

(فتح الباري: ۸/ ۵٤۲، ابن کثیر)

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے ''مستقر'' سے مکانی مستقر مراد ہے جس جگہ اس کا ایک دور مکمل ہوتا ہے۔ اور یہ مستقر عرش الٰہی کے نیچے ہے، وہاں سورج سجدہ کرتا ہے اور دوسرے دور کی اجازت طلب کرتا ہے اور اجازت ملنے پر دوسرا دور شروع کرتا ہے۔

سورج کا سجدہ کرنا:

قرآنِ پاک کی تعبیر میں ان احادیث پر مشاہدات سے اور ماہرین فلکیات کے بیان کی روشنی میں کئی اشکال وارد ہوتے ہیں:

۱: ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سورج اپنی رفتار ختم کر کے اپنے مستقر پر سجدہ ریز ہوتا ہے اور دوسرے دور کی اللہ تبارک وتعالیٰ سے اجازت ملتی ہے تو دوسرے دور کا آغاز کرتا ہے، حالانکہ سورج کی حرکت کا کسی وقت بھی انقطاع مشاہدے کے منافی ہے بلکہ سورج کا طلوع وغروب تو کسی نہ کسی مقام پر ہر وقت ہو رہا ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ سورج ہر لحظہ وقفہ کرتا ہے اور رک رک کر آگے بڑھتا ہے۔

۲: سورج کے سجدے کا مفہوم بھی مبہم ہے بلکہ طلوع وغروب میں ایک تسلسل ہے۔ ایک جگہ طلوع ہوتا ہے تو دوسری جگہ غروب ہو رہا ہوتا ہے تو غروب ہونے کے بعد سجدہ کرنے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں؟

۳: عرش کے بارے میں قرآنِ مجید اور احادیث مبارکہ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمام زمینوں اور آسمانوں کو محیط ہے اور ساری مخلوق عرش کے نیچے ہے، پھر غروبِ آفتاب کے بعد عرش کے نیچے جانے کا مطلب کیا ہے؟

یہ اشکالات دراصل حدیث کی بنیاد پر ہیں۔ تجدد پسندوں نے جن صحیح احادیث پر اعتراضات کیے ہیں ان میں سے ایک سورج کے سجدہ کرنے اور طلوع کے لیے اذن طلب کرنے کی یہی صحیح روایات بھی ہیں۔ قرآنِ مجید نے تو سورج کے چلنے کا ذکر کیا ہے اور اب سائنس دانوں اور ماہرین فلکیات نے بھی تسلیم کرلیا ہے کہ سورج بھی حرکت کرتا ہے اور اپنے پورے نظام کے ساتھ بڑی سبک رفتاری سے فضا میں دوڑ رہا ہے۔ البتہ سورج کے سجدہ کرنے کا ذکر قرآنِ مجید میں آیا ہے بلکہ آسمانوں اور زمین کے مابین پوری مخلوق کے سجدہ ریز ہونے کا ذکر ہے:

﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ وَ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ وَ النُّجُوْمُ وَ الْجِبَالُ وَ الشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَ كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ﴾ [الحج: ۱۸]

''کیا تُو نے نہیں دیکھا کہ بے شک اللہ، اسی کے لیے سجدہ کرتے ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور چوپائے اور اکثر لوگ۔''

انسان کا سجدہ کرنا تو معروف ہے مگر شمس وقمر، شجر وحجر اور حیوانات کے سجدے کی کیفیت کیا ہے اسے اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی جانتا ہے۔ جس ہستی کو یہ سب سجدہ کر رہے ہیں اس کے اپنے بیان کے بعد اس ساری مخلوق کے سجدہ ریز ہونے میں تو کسی ایمان دار کو شک نہیں ہوسکتا۔ سجدہ ہی نہیں بلکہ یہ ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کی ثنا خوانی میں بھی مصروف ہے:

❀...... ﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ

وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صَافَّاتٍ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ﴾ [النور: ٤١]

''کیا تُو نے نہیں دیکھا کہ بے شک اللہ، اس کی تسبیح کرتے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور پرندے پر پھیلائے ہوئے، ہر ایک نے یقیناً اپنی نماز اور اپنی تسبیح جان لی ہے۔''

❀...... ﴿تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِيهِنَّ وَ اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَ لٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ﴾ [الإسراء: ٤٤]

''ساتوں آسمان اور زمین اس کی تسبیح کرتے ہیں اور وہ بھی جو ان (آسمانوں اور زمین) میں ہیں اور کوئی بھی چیز نہیں مگر اس کی تسبیح کرتی ہے اور لیکن تم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے۔''

ساری مخلوق کی نماز اور تسبیح کیسی ہے؟ اس کی کیفیت بھی اسی کو معلوم ہے جس کی یہ تسبیح کررہے ہیں۔ اسی طرح ان کے سجدے کی حالت کو بھی اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ اسی طرح سورج کے سجدہ کرنے اور اجازت لینے کی کیفیت کو بھی اللہ ہی جانتا ہے۔

ہمارے مشاہدے کے مطابق آفتاب طلوع ہوتا ہے اور غروب ہوتا ہے، اسی مشاہداتی پہلو کو ایک مقام پر اللہ تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا ہے:

﴿حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ﴾ [الكهف: ٨٦]

''(کہ ذوالقرنین چلتے پھرتے) جب سورج غروب ہونے کے مقام پر پہنچا تو اسے پایا کہ وہ دلدل والے چشمے میں غروب ہورہا ہے۔''

یہ بھی ذوالقرنین کے مشاہدے کے مطابق ہے کہ وہ زمین کے مغربی جانب وہاں تک پہنچے جہاں آگے دلدل تھی اور انھیں یہی نظر آیا کہ سورج اس دلدل میں غروب ہو رہا ہے۔ کہاں سورج اور کہاں دلدل! قرآن پاک نے ﴿وَجَدَهَا تَغْرُبُ﴾ فرمایا ہے، ''کانت تغرب'' تو نہیں فرمایا۔ اسی طرح انسان کو مشاہداتی طور پر آفتاب طلوع ہوتا اور غروب ہوتا نظر آتا ہے، ورنہ حقیقت میں زمین پر اس کے ڈوبنے کی کوئی جگہ نہیں۔ اور حدیث میں ڈوبنے اور سجدہ ریز ہونے کا ذکر ''تحت العرش'' ہے۔

عرش عظیم زمین اور ساتوں آسمانوں کو محیط ہے بلکہ کرسی کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ﴾ [البقرة: ٢٥٥]

''اس کی کرسی آسمانوں اور زمین سے زیادہ وسیع ہے۔''

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ساتوں زمینیں اور ساتوں آسمان کرسی کے مقابلے میں ایسے ہیں جیسے ایک حلقہ چٹیل میدان میں ہو۔ اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ کرسی عرش کے مقابلے میں ایسے ہے جیسے ایک لوہے کا حلقہ چٹیل میدان میں ہو۔

(ابن کثیر: ۱/۴۱۵)

ماہرین فلکیات کے اندازے کے مطابق اس خلا کی وسعتوں کا اندازہ کیجیے کہ اس میں ایسے سیارے بھی ہیں جن کی روشنی ابھی تک زمین پر نہیں پہنچی بلکہ کہا گیا ہے کہ جو اَجرامِ فلکی موجودہ آلات سے نظر آتے ہیں ان کی روشنی زمین تک پہنچنے میں دس کروڑ سال لگ جاتے ہیں۔ اتنی وسیع وعریض فضا میں سورج کے تحت العرش سجدہ کرنے اور دورِ ثانی کے لیے طلوع ہونے کی اجازت طلب کرنے کی کیفیت کو حقیقتاً اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ جو آلات وتجربات ابھی تک ساری کائنات کے مشاہدے سے قاصر ہیں ان کے ذریعے اگر سورج کی اس حالت کو سمجھنے میں بہ ظاہر مشکل پائی جاتی ہے تو اس میں اچنبھے کی کیا بات ہے۔

سورج کے بارے میں یہ بات بھی قرآنِ مجید سے ثابت ہوتی ہے کہ اس کا مطلع ایک نہیں بلکہ ہر روز نئے مطلع سے طلوع ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کے طلوع وغروب ہونے کی سمت مشرق ومغرب ہے مگر یہ نت نئے زاویے سے طلوع ہوتا ہے۔ سردی وگرمی میں مطالع کا یہ اختلاف بالکل نمایاں ہوجاتا ہے۔ اسی کو ایک مقام پر ﴿رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ﴾ [المعارج: ٤٠] کے الفاظ سے بیان کیا

ہے۔ مشاہدہ بھی یہی ہے اور ماہرین فلکیات بھی یہی کہتے اور بتلاتے ہیں کہ سورج کے ۳۶۰ یا ۳۶۵ مطالع ہیں، اس لیے کیا بعید ہے کہ جب ایک مطلع کا دور پورا ہوتا ہے تو دوسرے مطلع پر طلوع ہونے کی اجازت لے کر طلوع ہوتا ہو، گویا یہ مطالع اس کے ''مستقر'' ہیں۔

ایک توجیہ یہ بھی کی گئی ہے کہ سورج جو عرش عظیم کے زیر سایہ ہے وہ اپنے دائرے میں حرکت کرتا اور تسلسل سے غروب ہوتا اور طلوع ہوتا ہے اور ہر لحظہ آگے بڑھنے کے لیے اذن طلب کرتا ہے، بال برابر بھی اس کی حرکت اللہ کی اجازت کے بغیر نہیں ہوتی بلکہ اس کی یہ حرکت ﴿ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ﴾ یعنی ایک قادر مطلق اور علیم وخبیر ذات کے حکم کے تابع ہے۔

شمس وقمر اللہ تعالیٰ کی بے مثال قدرت کی نشانیاں ہیں، گویا یہ مظاہر قدرت میں سے ہیں اور سرِ مُو حکم الٰہی سے انحراف نہیں کرتے۔ ان مظاہر قدرت کو انسان نے اپنی غفلت اور جہالت کی بنا پر قادر بنا دیا اور بڑا سمجھ کر انھیں معبود بنا لیا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس آیت میں بتلایا ہے کہ وہ تو قادر مطلق کے حکم سے چل رہے ہیں اور ان کی ایک ایک حرکت اللہ کی اجازت سے ہے۔ ایک وقت آئے گا کہ سورج آگے بڑھنے کی اجازت طلب کرے گا مگر اسے اجازت نہیں ملے گی، حکم ہوگا کہ واپس پلٹ جاؤ تو وہ الٹی سمت بہ جانب مغرب طلوع ہوگا۔ یہ قربِ قیامت کی علامت ہوگی کہ اب پہلا نظام الٹ دیا جائے گا۔ تب کسی کا بھی ایمان معتبر نہ ہوگا اور توبہ کا دروازہ بھی بند ہوجائے گا۔

مستقر کا دوسرا مفہوم:

دوسرا مفہوم جسے امام قتادہ نے بیان کیا ہے، یہ ہے کہ یہاں مستقر زمانی مراد ہے اور وہ قیامت کا دن ہے، یعنی یہ سورج اپنے وقت مقررہ کی طرف بڑھ رہا ہے، یہ اپنی رفتار یوں ہی جاری وساری رکھے گا، ایک لمحہ بھی اس میں تعطل نہیں آئے گا مگر یہ سب حرکت ایک وقت مقرر تک ہے۔ قرآنِ مجید سے بھی اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى اَلَا هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ﴾

[الزمر: ۵]

''اس نے آسمانوں کو اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا، وہ رات کو دن پر لپیٹتا ہے اور دن کو رات پر لپیٹتا ہے اور اس نے سورج اور چاند کو تابع کر رکھا ہے، اور ہر ایک مقرر وقت کے لیے چل رہے ہیں۔ سن لو! وہی سب پر غالب، نہایت بخشنے والا ہے۔''

اس آیت میں شمس وقمر کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ وہ دونوں ایک مقرر وقت کے لیے چل رہے ہیں، یعنی ان کی یہ حرکت ایک میعادِ معین پر پہنچ کر ختم ہوجائے گی۔ اور یہ میعادِ مقرر قیامت کا دن ہے۔ یہاں ﴿اَجَلٍ مُّسَمًّى﴾ سے مراد مقررہ مقام بھی ہوسکتا ہے جیسا کہ اوپر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے۔

علامہ رازی نے اس کے علاوہ بھی شمس وقمر کے مستقر کی توجیہات بیان کی ہیں مگر حدیث میں اس کی وضاحت کے بعد دیگر تمام توجیہات کی چنداں ضرورت نہیں رہتی۔

﴿ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ﴾ سورج کی یہ حرکت جو مقرر ومتعین مدار میں ایک منٹ کی تقدیم وتاخیر کے بغیر مسلسل ہورہی ہے، یہ اپنے مدار سے ذرہ برابر بھی نہیں ہٹتا حتی کہ کہا گیا ہے کہ اگر یہ اپنے مدار سے معمولی سا اوپر ہوجائے تو برودت (ٹھنڈک) بڑھ جائے اور اگر معمولی سا نیچے آجائے تو اس کی تپش سے ہر چیز جل جائے۔ یہ سارا نظام اس بات کی کھلی شہادت ہے کہ یہ نظام خود کار طریقے سے نہیں چل رہا بلکہ یہ ایک غالب قادرِ مطلق اور ہر چیز کا پوری طرح علم رکھنے والے کے اندازے اور فیصلے کے مطابق ہے۔ اسے معلوم ہے کہ سورج کا بُعد زمین سے کتنا ہونا چاہیے۔

درسِ حدیث

توفیق الباری

"الادب المفرد" للبخاری کا اردو ترجمہ مع تشریحات وفوائد

از حضرت نواب سید صدیق حسن خان صاحب رحمہ اللہ

تسہیل: حافظ محمد اشرف سعید (نیوکرول شالامار باغ۔ لاہور)

١٣٤٣ . عن نافع أن نفرا من أهل العراق دخلوا على ابن عمر، فرأوا على خادم لهم طوقا من ذهب فنظر بعضهم إلى بعض فقال: ما أفطنكم للشر .

"حضرت نافع بیان کرتے ہیں کہ اہل عراق میں سے کچھ لوگ حضرت عبداللہ بن عمر کے پاس آئے تو انھوں نے حضرت ابن عمر کی خادمہ کے گلے میں سونے کا ہار دیکھا۔ انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم لوگوں کی نظریں شر کے لیے کتنی تیز ہیں۔"

باب: فضول الكلام

فضول باتیں کرنا

١٣٤٤ . عن أبي هريرة قال: لا خير في فضول الكلام . (ضعيف الإسناد)

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: فضول باتیں کرنے میں کوئی خیر نہیں۔"

١٣٤٥ . عن أبي هريرة عن النبي ﷺ قال: ((شرار أمتي الثرثارون المتشدقون المتفيهقون، وخيار أمتي أحاسنهم أخلاقا .))

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "میری امت کے بدترین وہ لوگ ہیں جو زیادہ بولنے والے ہیں، فر فر منھ پھاڑ کر تکلف سے باتیں کرتے ہیں۔ اور میری امت کے بہترین وہ لوگ ہیں جو اخلاق کے اعتبار سے اچھے ہیں۔"

باب: ذو الوجهين

دوغلا آدمی

١٣٤٦ . عن أبي هريرة أن رسول الله ﷺ قال: ((من شر الناس ذو الوجهين الذي يأتي هؤلاء بوجه وهؤلاء بوجه .))

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "سب سے بُرے لوگوں میں سے وہ شخص ہے جو دو رُخا ہے جو ایک طرف جا کر کوئی اور بات کرے اور دوسری طرف جا کر کوئی اور۔"

باب: اثم ذي الوجهين

گناہ دوغلے آدمی کا

١٣٤٧ . عن عمار بن ياسر قال: سمعت النبي ﷺ يقول: ((من كان ذا وجهين في الدنيا كان له لسانان يوم القيامة من نار .)) فمر رجل كان ضخما قال: ((هذا منهم .))

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے، انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: "جو اس دنیا میں دوغلا ہوگا آخرت میں اس کی آگ کی دو زبانیں ہوں گی۔" اتنے میں ایک موٹا آدمی وہاں سے گزرا تو آپ ﷺ نے فرمایا: "یہ بھی ان میں سے ہے۔"

جرعات

مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ

برصغیر کے مدارس میں مروج کتب حدیث کے مسلک محدثین کے مطابق مختصر حواشی آپ یوں سمجھیں کہ ان کا مقصد حیات تھا۔ چونکہ تمام مدارس دینیہ میں حدیث کی ابتدائی کتاب مشکاۃ شریف سب سے پہلے پڑھائی جاتی ہے اس لیے مشکاۃ شریف کے حواشی ان کے خیال میں سب سے اہم تھے۔ جس میں ان کے فکری دوست حافظ محمد زکریا بن میاں محمد باقر رحمہما اللہ (جھوک دادو) شریک فکر وعمل تھے۔ چنانچہ ذیل کے اداریے میں ان کے فکر اور عمل کی مختصر روئداد آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔ اس اداریے میں جن کتب کے غیر مطبوع ہونے پر مولانا نے حسرت کا اظہار کیا تھا وہ بحمد اللہ سب طبع ہوچکی ہیں۔ ان کتب کے ناموں پر حواشی میں اپنے محدود علم کے مطابق کچھ اجمالی تعارف کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ (احمد شاکر)

حدیث کی متداول ومعروف کتاب مشکاۃ شریف کی ایک مبسوط شرح مرعاۃ المفاتیح کی ایک جلد حال ہی میں طبع ہوکر آئی ہے جسے دیکھ کر یہ مقولہ یاد آ گیا: "کم ترك الأول للآخر." بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ شرح بے نظیر ہے۔ حلِ لغات وغریب الحدیث، حل مشکلاتِ حدیث، رجال پر ناقدانہ کلام، تخریجِ احادیث، مسائلِ فقہیہ پر سیر حاصل مباحث، اصحاب الحدیث واصحاب الرائے (باصطلاح شاہ ولی اللہ صاحب) کے دلائل کا تفصیلی جائزہ، تراجمِ صحابہ اور مصنّفین وائمہ حدیث سب کو حاوی ہے۔ اس جامعیت کی حامل مشکاۃ کی اب تک کوئی شرح نہیں ہوئی۔ جہاں تک مطالبِ حدیث کی وضاحت کا تعلق ہے، بلاشبہ مصنف مشکاۃ کے شیخ واستاذ علامہ حسین بن محمد الطیبی رحمہ اللہ (م ۷۴۳ھ) کی شرح الکاشف عن حقائق السنن اس بارے میں بہترین تسلیم کی گئی ہے مگر افسوس کہ وہ اب تک طباعت سے محروم ہے۔ [1] عرصہ ہوا مولانا نواب حبیب الرحمٰن صاحب شروانی مرحوم ومغفور نے ان سطور کے راقم کے نام ایک خط میں اس کی طباعت پر آمادگی کا ارادہ ظاہر کیا تھا، پھر معلوم نہیں اس کا کیا ہوا۔

اس کے بعد شیخ عبدالحق دہلوی رحمہ اللہ کی لمعات التنقیح [2] اور مولانا علی قاری کی مرقاۃ [3] کا درجہ ہے مگر اول الذکر اب تک طبع نہیں ہوسکی اور ثانی الذکر پانچ ضخیم جلدوں میں آج سے ستر برس قبل مصر سے شائع ہوئی تھی مگر ایک مدت سے بالکل نایاب ہے۔

ان دونوں شرحوں میں، اللہ تعالیٰ ان کے مؤلفین کو جزائے خیر دے، بڑی عمدگی سے ایضاحِ مطالب سے متعلقہ مواد جمع کردیا گیا جو بہت خوب ہے، تاہم علاوہ اس کے کہ ان میں فقہیات وحلِ مشکلات کے لیے ایک ہی نقطہ نظر یعنی حنفی مکتبِ فکر، کی نمائندگی کو بالالتزام ملحوظ رکھا گیا ہے، پھر تخریج وتنقید احادیث کے اعتبار سے بھی بالکلیہ تشنہ ہیں۔ حالانکہ مشکاۃ کی شرح، بالخصوص فصل ثالث، میں اس کی شدید ضرورت ہوتی ہے۔

مصابیح السنۃ للبغوی ومشکاۃ شریف کی تخریجِ احادیث اور حسبِ ضرورت ان پر ناقدانہ بحث ونظر کی ضرورت کو اصحابِ علم ہمیشہ سے

---

[1] جو بحمد اللہ ۱۴۱۳ھ میں ...... طبع اوّل ...... کراچی اور ...... طبع دوم ...... ۱۴۱۷ھ میں سعودیہ میں طبع ہوچکی ہے۔

[2] بحمد اللہ یہ کتاب بھی مولانا کے شاگرد رشید حافظ عبدالرحمٰن الجوہری رحمہ اللہ (گوہڑوی) کے مکتبہ معارف علمیہ نے ۹۵-۱۳۹۰ھ (پانچ سال میں) میں مولانا مفتی عبید اللہ حفظہ اللہ (مہتمم الجامعۃ الاشرفیہ لاہور) کی تحقیق وتعلیق اور حافظ عبدالرحمٰن رحمہ اللہ کی تخریج کے ساتھ چار جلدیں طبع ہوچکی ہیں لیکن افسوس کہ یہ شرح مکمل نہ ہوسکی۔

[3] قدیم طبع کے بعد مرقات کا ایک عمدہ ایڈیشن مکتبہ امدادیہ ملتان سے ۱۱ جلدوں میں کئی سال قبل طبع ہوکر مارکیٹ میں مل رہا ہے۔

محسوس کرتے چلے آئے ہیں، چنانچہ علامہ محمد بن ابراہیم مناوی الشافعی (م۷۴۶ھ) نے كشف المناهج والتناقيح في تخريج أحاديث المصابيح [1] لکھی تو حافظ ابن حجر عسقلانی (م۸۵۲ھ) نے هداية الرواة إلى تخريج أحاديث المصابيح والمشكاة [2] تصنیف فرمائی۔ لیکن افسوس ہے آج ہم لوگ ان دونوں سے محروم ہیں۔ عرصہ ہوا حضرت مولانا سیّد محمد نذیر حسین محدث رحمہ اللہ ہی کے ایک فیض یافتہ جناب مولانا احمد حسن محدث دہلوی (۱۳۳۸ھ، ۱۹۲۰ء) اور حضرت الاستاذ مولانا محمد شرف الدین صاحب مدظلہ العالی نے تنقيح الرواة في تخريج أحاديث المشكاة تحریر کی تھی جو مختصر ہونے کے باوجود بہت مفید ہے۔ جس کا پہلا نصف [3]، یعنی ربع اول ۱۳۲۵ھ میں مطبع انصاری دہلی سے اور ربع ثانی ۱۳۳۳ھ میں مطبع مجتبائی دہلی سے شائع ہوا تھا مگر دوسرا نصف [4]، جو زیادہ اہم تھا، مطبع مجتبائی والوں کی بے اعتنائی سے ضائع ہوگیا، إنا لله وإنا إليه راجعون.

الحمد للہ کہ فاضل نبیل حضرت مولانا عبید اللہ صاحب مبارک پوری دامت برکاتہم کی تصنیف فرمودہ یہ شرح تکمیل کو پہنچ گئی تو نہ صرف یہ کہ ان سب سے مستغنی کردے گی بلکہ مرقات ولمعات کی ضرورت بھی نہایت عمدگی سے پوری کرے گی۔ ثلث کتاب کی شرح ہو چکی ہے۔ مطبوعہ حصہ دوسری جلد ہے جو تحفۃ الاحوذی کے سائز اور ۵۰۰ صفحات پر خود مولانا ممدوح کی نگرانی میں طبع ہوا ہے۔

جلد اول المکتبۃ السلفیۃ لاہور کے زیر اہتمام مولانا محمد باقر صاحب مدظلہ العالی (مہتمم مدرسہ خادم القرآن والحدیث، جھوک دادو طور، ضلع لائل پور، مغربی پاکستان) کی سرپرستی میں طبع ہو رہی ہے جو ان شاء اللہ بہت جلد منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوگی۔ جلد اول و دوم مل کر ربع مشکاۃ (کتاب الجنائز ختم) تک یہ شرح پہنچ چکی ہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ اس مبارک کام کو تکمیل تک پہنچائے اور حسنِ قبول کی نعمت سے سرفراز فرمائے۔

۱۹۴۸ء میں خاکسار راقم سطور کی تحریک وتجویز پر محبّ مکرم مولانا حافظ محمد زکریا صاحب (خلف الرشید مولانا محمد باقر صاحب موصوف)، اللہ ان کو کروٹ کروٹ جنت الفردوس کی نعمتوں سے نوازے، نے حضرت شیخ الحدیث مولانا عبید اللہ صاحب رحمانی مبارک پوری دام مجدہ کی خدمت میں مشکاۃ پر کام کرنے کی درخواست کی۔ مولانا ممدوح نے بڑی خندہ پیشانی سے منظور فرما کر کام شروع کر دیا تھا کہ چند ہی دنوں بعد مولانا حافظ محمد زکریا تو اللہ کو پیارے ہوگئے لیکن ان کا یہ صدقہ جاریہ اس عالم ناسوت میں بھی ان کی یاد تازہ رکھے ہوئے ہے۔

شاید مرحوم ہی کے اخلاص کا یہ نتیجہ ہے کہ نامساعد حالات کے باوجود ان کا جاری کیا ہوا کام بدستور ہوا جا رہا ہے۔ والله لا يضيع أجر المحسنين.

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے!

ناسپاسی ہوگی اگر اس امر کا ذکر نہ کیا جائے کہ حدیث پاک کی اس خدمت میں ہماری جماعت کے مخیّر اصحابِ ثروت کا بہت بڑا حصہ

---

[1] اس کتاب کی دوسری اور تیسری طبع ۱۴۲۶ھ اور ۱۴۲۷ھ میں سعودیہ سے طبع ہو چکی ہیں۔

[2] اسی طرح ہدایۃ الرواۃ بھی دار ابن القیم (بریدہ) سعودیہ سے طبع ہو چکی ہے۔

[3] بحمد اللہ اس نصف اول کی طبع مجتبائی کا عکس دار الدعوۃ السلفیہ ایک عرصہ سے طبع کر رہا ہے۔

[4] اس کا گم شدہ قلمی نسخہ ...... من جد وجد کے مطابق ...... مولانا نے وارثان مطبع مجتبائی سے خرید لیا تھا وہ چونکہ کرم خوردہ تھا اس کے الجزء الثالث کو مولانا نے پہلے نقل کرایا، پھر کرم خوردہ بیاض مکمل کیا اور اس میں حل لغت اور طلباء کی ضرورت کے مختصر حواشی تحریر کیے۔ اس کے بعد مولانا فالج کی طویل بیماری میں مبتلا ہو گئے لیکن اس کے الجزء الرابع پر اپنی نگرانی میں مولانا حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ اور جنت مکیں قاری نعیم الحق نعیم رحمہ اللہ سے، الجزء الثالث کے منہج پر کام کروایا اور اپنی نگرانی ہی میں ان کی طباعت بھی مکمل کی۔ اب یہ کتاب مکمل ...... نصف اول مطبع مجتبائی کا عکس ...... اور الجزء الثالث والجزء الرابع تکمیل حواشی کے ساتھ مارکیٹ میں موجود ہے۔

ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان ہی کی ہمت سے اتنا بڑا کام سرانجام پا گیا ہے، چنانچہ دوسری جلد کی تیاری اور طباعت کے اخراجات ہندوستان کی جماعت اہل حدیث کے چند اربابِ جود وسخا نے برداشت کیے ہیں اور جلد اول پر جماعت اہل حدیث جھوک دادو وغیرہ کے سب اخراجات اٹھ رہے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ اگر کام صحیح طور سے کیا جائے تو جماعت اہل حدیث میں ایسے صاحب دل جوہر موجود ہیں جو قرآن وحدیث کی خدمت کے لیے کسی بھی مالی قربانی سے دریغ نہیں کرتے ع

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی!

ابھی کل کی بات ہے کہ المکتبۃ السلفیۃ لاہور نے جدید تعلیقات، نئے انداز اور حسن طباعت کے ساتھ صحاح ستہ کی کتاب سنن نسائی شریف شائع کی ہے جس کی وجہ سے پچھلے پچیس تیس سال کے بعد پہلی دفعہ وہ جمود ٹوٹا جس نے ہمارے اعصاب پر اضمحلال طاری کر رکھا تھا کیوں کہ ترمذی مع شرح تحفۃ الاحوذی کے بعد صحاح ستہ کی یہ پہلی کتاب ہے جو اہل حدیث نے شائع کی ہے۔ مگر اس میں ہمت ان ہی مخلص ومخیّر حضرات کی ہے جنھوں نے آڑے وقت میں المکتبۃ السلفیۃ لاہور کی طرف ہمدردی کا ہاتھ بڑھایا اور ہزاروں روپے سے، گو بہ صورتِ قرض ہی سہی، اس کی اعانت فرمائی۔

میری مراد محترم خان عبدالعظیم خان صاحب فیروز پوری، محترم حاجی عبدالرحمٰن صاحب پٹیالوی (خانیوال) اور مکرم میاں محمد عالم صاحب پٹوی ٹھیکیدار (لاہور) وغیرہم، سے ہے کہ اول الذکر ہر دو دوستوں نے کتابت وغیرہ کے اخراجات مرحمت فرمائے اور آخر الذکر بزرگ نے کاغذ کے لیے رقم عنایت فرمائی۔ جزاهم الله تعالى جزاء حسنا.

اور حقیقۃ الحقائق تو یہ ہے کہ إذا أراد الله شيئا هيأ أسبابه. اس دور میں، جو جا رہا ہے، رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی راہنمائی کی شدید ترین ضرورت ہے جس کا ذریعہ صرف حدیث وعلومِ حدیث کا شیوع وذیوع ہے، یہی وجہ ہے کہ ''بیگانوں'' اور ''اپنوں'' نے حدیث پاک کے انکار ومخالفت پر کمر باندھ لی بلکہ اس کے خلاف محاذ قائم کر رکھا ہے مگر اللہ تعالیٰ اپنی سنت کے مطابق دین کی حفاظت حدیث پاک کی اشاعت کے ذریعے کر رہا ہے:

﴿وَ مَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ وَ اللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ﴾

[آلِ عمران: ٥٤]

اللہ تعالیٰ ہی اپنے بندوں کے دلوں میں جذبہ پیدا کرتا ہے اور وہی اس کے لیے اسباب مہیا فرماتا ہے۔ ولله الأمر من قبل ومن بعد.

خوش نصیب ہیں وہ نفوس سعیدہ جن سے حق تعالیٰ قرآن پاک اور حدیثِ رسولِ پاک ﷺ کی اشاعت کی خدمت لے لے اور اس مقدس مشن کے لیے وہ ذریعہ بن جائیں۔ اللهم اجعلنا منهم واحشرنا في زمرتهم.

مغربی پاکستان کی جماعت اہل حدیث کے واحد جماعتی تعلیمی ادارے الجامعۃ السلفیۃ لائل پور کا اپنے اصل مجوزہ مقام پر، پہلا سال بتوفیقہ تعالیٰ بہ خیر وخوبی ختم ہو گیا اور ہمارے اندازے کے مطابق تعلیم کا معیار بھی خاصا اچھا رہا۔ فالحمد لله وحده.

اہل حدیث کے بہت سے مدارس انفرادی طور پر اپنی اپنی جگہ قابل قدر تعلیمی خدمات سرانجام دے رہے ہیں لیکن الجامعۃ السلفیۃ جماعتی ادارہ ہے اور بڑے منصوبے کے حامل نظریے کے تحت عمل میں لایا گیا ہے، اس لیے جماعت کو اس طرف پوری توجہ اور اپنے قومی کاموں میں اس کو سرفہرست رکھنا چاہیے۔

اس وقت تعمیر کی طرف فوری توجہ کی ضرورت ہے۔ اب تک کام چلانے کے لیے کل ۱۵ کمرے بن سکے ہیں۔ اساتذہ اور طلباء کو رہائش کی دقتوں کے علاوہ مسجد کے نہ ہونے کی وجہ سے بھی بہت تکلیف ہے۔ جامعہ سلفیہ کمیٹی (رجسٹرڈ) کو چاہیے کہ قریبی فرصت میں ایک اجلاس کرے اور اس میں ایک لائحۂ عمل مرتب کر کے مجوزہ نقشے کے مطابق اب تعمیر کا کام بھی شروع کر دے۔ ہمت کی جائے تو آئندہ سال میں الجامعۃ السلفیۃ کی تعلیمی ترقی کے کافی امکانات ہیں۔ اللہ تعالیٰ اخلاص، عمل اور محنت کی توفیق بخشے۔

مسائل اعتکاف

☆......معتکف کے لیے روزے کا حکم ☆......عورت کہاں اعتکاف کرے؟

امان اللہ عاصم

اعتکاف چاہے چند گھنٹوں کا ہو یا کچھ دنوں کا بہ ہرصورت اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک اعلیٰ عمل ہے۔ رمضان المبارک کے آخری ایام میں اعتکاف کرنا مسنون اور انتہائی اعلیٰ عمل ہے، اس کے ذریعے سے انسان لیلۃ القدر کی مبارک اور عظیم ساعتوں کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوسکتا ہے۔

بعض لوگ اعتکاف کرنا چاہتے ہیں لیکن صرف اس وجہ سے اسے ترک کردیتے ہیں کہ وہ کسی مرض یا کمزوری کی شدت کی بنا پر روزہ نہیں رکھ سکتے یا مرض اور کمزوری کی وجہ سے ایک آدھ روزہ چھوڑنا ان کی مجبوری بن جاتا ہے۔ ان کے دل میں یہ خیال پختہ کردیا گیا ہے کہ اگر روزہ نہیں رکھیں گے تو اعتکاف کا کوئی فائدہ نہیں۔ جب کہ روزہ ایک الگ عبادت ہے اور اعتکاف ایک الگ عمل، اعتکاف کے لیے روزہ ضروری اور شرط نہیں ہے۔

معتکف کے لیے روزے کو لازمی قرار دینے والوں کی دلیل سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ آپ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

”السنة لا اعتكاف إلا بصوم ولا اعتكاف إلا في مسجد جامع .“

(سنن أبي داود، رقم الحديث : ۲۴۷۳)

یعنی سنت یہ ہے کہ اعتکاف روزے اور جامع مسجد کے بغیر نہ ہو۔

کہا جاتا ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس روایت میں واضح الفاظ میں مذکور ہے کہ روزے کے بغیر اعتکاف نہیں ہوتا۔

معزز قارئین! الشیخ حافظ زبیر علی زئی حفظہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اس حدیث کی سند میں امام زہری کی عروہ سے روایت معنعن ہے اور سماع کی تصریح بھی ثابت نہیں ہے۔ (آپ کے مسائل: ۱/۲۹۵) جس کی وجہ سے یہ روایت معتبر نہیں ہے۔

جب کہ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ معتکف کے لیے روزہ ضروری اور شرط نہیں ہے جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں باب باندھا ہے: ”باب من لم ير عليه صوما إذا اعتكف“ اور اس کے تحت روایت بیان کرتے ہیں:

”عن عمر بن الخطاب رضي الله عنه أنه قال: يا رسول الله صلى الله عليه وسلم! إني نذرت في الجاهلية أن أعتكف ليلة في المسجد الحرام، فقال له النبي صلى الله عليه وسلم: ((أوف بنذرك .)) فاعتكف ليلة .“

(صحيح بخاری، رقم الحديث : ۲۰۴۲)

” سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں نے زمانہ جاہلیت میں مسجد حرام میں ایک رات کے اعتکاف کی نذر مانی تھی۔ (کیا میں اس نذر کو پورا کروں؟) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ہاں! اپنی نذر پوری کرو۔“ چنانچہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ایک رات کا اعتکاف کیا۔“

اس روایت سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ ثابت کیا ہے کہ اعتکاف کرنے کے لیے روزہ ضروری نہیں ہے۔ اگر اعتکاف کے لیے روزہ شرط ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو روزے کا بھی حکم دیتے کہ رات اعتکاف کرو اور صبح روزہ ضرور رکھنا جب کہ ایسا نہیں فرمایا۔

ایک روایت میں روزے کا ذکر بھی ہے لیکن وہ روایت ضعیف ہے۔ اس کے الفاظ یوں ہیں کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کعبہ کے نزدیک ایک رات یا ایک دن کا اعتکاف کرنے کی نذر مانی تھی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

((اعتكف وصم .))

(سنن أبي داود، رقم الحديث : ٢٤٧٤)

''اعتکاف کرو اور روزہ بھی رکھو۔''

محدث کبیر علامہ ناصر الدین البانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"صحيح دون قوله: "وصم ."

(صحيح أبي داود، رقم الحديث : ٢١٦١)

یعنی یہ روایت ''روزہ بھی رکھ'' کے الفاظ کے علاوہ صحیح ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اگر معتکف کے لیے روزہ شرط ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو ضرور حکم دیتے۔ جو روایت عمرو بن دینار نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے واسطے سے بیان کی ہے اس میں صراحت سے ذکر ہے کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو (نذر کے اعتکاف کے ساتھ) روزے کا حکم بھی (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے) دیا تھا لیکن اس کی سند ضعیف ہے۔ اور اس میں یہ اضافہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ اعتکاف کرو اور ساتھ روزہ بھی رکھو۔ اس روایت کو امام ابوداود اور امام نسائی رحمۃ اللہ علیہما نے عبداللہ بن بدیل کے طریق سے روایت کیا ہے۔ اور وہ ضعیف ہے۔ ابن عدی اور دارقطنی رحمۃ اللہ علیہما نے بیان کیا ہے کہ روزے کے حکم کے اضافی الفاظ والی روایت کو عمرو بن دینار سے روایت کرنے میں عبداللہ بن بدیل تنہا ہے۔'' (فتح الباري : ٤/٢٧٤)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو ایک رات کے اعتکاف کی نذر پوری کرنے کا حکم دینا اس بات کی دلیل ہے کہ اعتکاف کے لیے روزہ ضروری نہیں ہے کیوں کہ رات میں کونسا روزہ ہوتا ہے؟ علامہ شمس الحق عظیم آبادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے موافقین کے ہاں بھی صحتِ اعتکاف کے لیے روزہ شرط نہیں ہے۔''

(عون المعبود : ٧/٩٦)

اور اسی طرح سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر رمضان میں اعتکاف کیا کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز پڑھنے کے بعد اپنے اعتکاف کے خیمہ میں جاتے تھے۔ (راوی کہتا ہے کہ) سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اعتکاف کی اجازت چاہی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اجازت دے دی، اس لیے انھوں نے بھی (اپنے لیے) ایک خیمہ لگالیا۔ سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا نے سنا تو انھوں نے بھی ایک خیمہ لگا لیا۔ سیدہ زینب رضی اللہ عنہا نے سنا تو انھوں نے بھی ایک خیمہ لگا لیا۔ صبح کو جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ کر لوٹے تو چار خیمے نظر آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: ''یہ کیا ہے؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حقیقت حال کی اطلاع دی گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''انھوں نے ثواب کی نیت سے یہ نہیں کیا (بلکہ ایک دوسری کی ضد سے کیا ہے) ان کے خیمے اکھاڑ دو۔'' اور آپ نے بھی (اس سال) رمضان میں اعتکاف نہیں کیا بلکہ شوال کے آخری عشرے میں اعتکاف کیا۔''

(صحيح بخاري، رقم الحديث : ٢٠٤١)

مذکورہ روایت پر غور کریں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شوال میں اعتکاف کیا تھا تو کیا اس بات کا کوئی ذکر ملتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شوال میں اعتکاف کے دوران روزے رکھے ہوں؟

اسی طرح ایک روایت میں ہے، ابو سہیل کہتے ہیں کہ میری بیوی کے ذمہ مسجد حرام میں تین دن کا اعتکاف (نذر ماننے کی وجہ سے واجب) تھا۔ میں نے عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا: کیا اس کے لیے روزہ ضروری ہے؟ امام زہری (جو عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بیٹھے تھے) کہنے لگے کہ اعتکاف تو روزے کے بغیر ہوتا ہی نہیں۔ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے پوچھا: یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے؟ انھوں نے کہا: نہیں۔ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا: سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے؟ انھوں نے کہا: نہیں۔ عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا: کیا یہ بات سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے ثابت

ہے؟ انھوں نے کہا: نہیں۔ عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا: کیا یہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے؟ انھوں نے کہا: نہیں۔ پھر عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: میں اس عورت پر روزہ ضروری نہیں سمجھتا۔

ابو سہیل کہتے ہیں: میں ان کے پاس سے باہر نکلا اور امام طاؤس اور عطاء بن ابی رباح رحمہما اللہ سے ملا تو ان سے بھی میں نے یہی سوال پوچھا۔ امام طاؤس رحمہ اللہ نے فرمایا: سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ بھی ایسی عورت کے لیے روزہ ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ ہاں، اگر اس نے نذر مان کر روزے بھی اپنے اوپر فرض نہ کر لیے ہوں۔

(سنن الدارمي: ١/ ٧٠)

امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اگر کوئی روزے کے بغیر اعتکاف کرتا ہے تو جائز ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا بھی یہی موقف تھا۔ سیدنا علی المرتضیٰ اور سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہما بھی یہی فرماتے تھے کہ (معتکف) چاہے تو روزہ رکھ لے، چاہے تو نہ رکھے۔

(فقه السنه: ١/ ٤٧٨، ٤٧٩)

معزز قارئین! حقیقت مسئلہ یہ ہے کہ رمضان المبارک کے روزے فرض ہیں۔ انھیں جان بوجھ کر بغیر کسی شرعی عذر کے چھوڑنا سخت گناہ اور بد قسمتی ہے۔ جو آدمی رمضان المبارک کی آخری راتوں میں اعتکاف کرے اسے چاہیے کہ روزے کا اہتمام بھی کرے، کسی شرعی عذر کے بغیر روزہ نہ چھوڑے۔ اور اگر کسی نے اعتکاف کرنے کا ارادہ کیا لیکن روزے شدید مرض یا کمزوری و بڑھاپے کی بنا پر نہیں رکھ سکتا تو اسے اعتکاف کرنے میں کوئی رکاوٹ اور ممانعت نہیں ہے۔ اور اگر ابتدائے اعتکاف میں روزے رکھتا رہا لیکن درمیان میں بیمار ہوگیا تو اب ایسا شخص روزے تو نہیں رکھ سکتا لیکن اعتکاف پورا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو وہ بغیر روزے کے اعتکاف پورا کر سکتا ہے۔

اگر کسی نے ایک، دو یا زیادہ دنوں یا راتوں کا اعتکاف کرنے کی نذر مانی تو اس کے لیے اعتکاف کی نذر پوری کرنے کے لیے روزے رکھنے ضروری نہیں ہیں۔ اگر اس نے اعتکاف کے ساتھ روزوں کی بھی نذر مانی تو ایسی صورت میں نذر کے روزے فرض ہوں گے اور ان کی ادائیگی لازم۔

خواتین کا اعتکاف

عورت کے لیے اعتکاف کی مشروعیت:

جمہور علماء کرام کا موقف ہے کہ اعتکاف کرنا جس طرح مردوں کے لیے مشروع اور مسنون ہے اسی طرح عورت کے لیے بھی مسنون ہے کیوں کہ اعتکاف کے احکام سے متعلق آیات و احادیث کا عموم اس بات کی دلیل ہے کہ جس طرح اعتکاف کرنا مردوں کے لیے مشروع اور مسنون ہے اسی طرح عورتوں کے لیے بھی مشروع اور مسنون ہے۔ مزید برآں امہات المومنین رضی اللہ عنہن کا اعتکاف کرنا بھی خواتین کے لیے اعتکاف کے مشروع و مسنون ہونے کی واضح دلیل ہے۔ امہات المومنین رضی اللہ عنہن نبی کریم ﷺ کی حیات مبارکہ میں اور آپ ﷺ کی وفات کے بعد بھی اعتکاف کیا کرتی تھیں۔ ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں:

"اعتكف مع رسول الله ﷺ امرأة من أزواجه." (صحيح بخاري، رقم الحديث: ٢٠٣٧)

''رسول اللہ ﷺ کے ساتھ آپ ﷺ کی ایک بیوی نے بھی اعتکاف کیا۔''

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں:

"أن النبي ﷺ كان يعتكف العشر الأواخر من رمضان حتى توفاه الله ثم اعتكف أزواجه من بعده." (صحيح بخاري، رقم الحديث: ٢٠٢٦، صحيح مسلم، رقم الحديث: ١١٧٢)

''نبی کریم ﷺ رمضان کے آخری دس دنوں میں اعتکاف کیا کرتے تھے حتی کہ آپ ﷺ کی وفات ہوگئی، پھر آپ ﷺ کے بعد آپ ﷺ کی ازواج اعتکاف کیا کرتی تھیں۔''

البتہ یہ ضروری ہے کہ عورت اپنے سرپرست سے اجازت لے کر اعتکاف کرے جیسے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم ﷺ سے اعتکاف کرنے کی اجازت طلب کی تو آپ ﷺ نے اجازت دے دی، تب

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے اعتکاف کیا۔

(صحيح بخاري، رقم الحديث : ٢٠٤١)

عورت کے سرپرست کو بھی چاہیے کہ اگر حالات سازگار اور مساجد میں خواتین کے لیے عبادت کا انتظام موجود ہو تو انھیں مسجد جانے سے نہ روکیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

((فلا تمنعوا إماء الله مساجد الله .))

(صحيح بخاري، رقم الحديث : ٥٢٣٨)

''اللہ کی بندیوں کو اللہ کی مساجد میں جانے سے منع نہ کرو۔''

لیکن اگر حالات مناسب نہ ہوں اور کسی فتنے کا ڈر اور خدشہ ہو یا گھریلو ذمہ داریوں میں خلل اور خرابی پیدا ہوتی ہو یا خاوند اور سرپرست مسجد میں بھیجنا مناسب نہ سمجھتا ہو تو گھر میں ہی نماز وغیرہ کی ادئیگی عورت کے لیے بہتر ہے۔ اس سلسلے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان موجود ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابیہ کو فرمایا تھا:

'' تیرے گھر میں تیری نماز محلے کی مسجد میں نماز سے بہتر ہے۔'' (مسند أحمد : ٦/ ٣٧١، صحيح ابن حبان : ٥/٥٩٥)

عورت کہاں اعتکاف کرے؟

مردوں کے اعتکاف کے سلسلے میں اتفاق ہے کہ وہ مسجد ہی میں اعتکاف بیٹھیں لیکن خواتین کے بارے اختلاف ہے، اس لیے ہم یہاں صرف اس مسئلے کی وضاحت کریں گے کہ جو خواتین اعتکاف کرنا چاہتی ہیں وہ کیا کریں؟

اعتکاف صرف مسجد میں:

جس طرح مرد صرف مسجد ہی میں اعتکاف کر سکتے ہیں، اسی طرح عورت کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ مسجد ہی میں اعتکاف کرے۔ یہ بات مندرجہ ذیل دلائل سے ثابت ہوتی ہے:

① ...... اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَلَا تُبَاشِرُوْ هُنَّ وَ أَنْتُمْ عَاكِفُوْنَ فِي الْمَسَاجِدِ﴾

[البقرة : ١٨٧]

''اور جب تم مسجد میں اعتکاف بیٹھے ہوئے ہو تو ان (بیویوں) سے مباشرت نہ کرو۔''

اس آیت مبارکہ میں اعتکاف کو مسجد کے ساتھ خاص کیا گیا ہے۔ ﴿أَنْتُمْ عَاكِفُوْنَ﴾ مذکر کا صیغہ ہونے کی بنا پر ظاہری طور پر تو مردوں کے لیے ہے لیکن اس کے حکم میں عورتیں بھی شامل ہیں۔ اور اس کی تصدیق اس سے پچھلے الفاظ ﴿وَلَا تُبَاشِرُوْ هُنَّ﴾ سے ہوتی ہے کہ اگر اعتکاف کے دوران مسجد میں بیویاں موجود ہوں گی تو ان سے مباشرت کی ممانعت ہوگی۔ اگر مرد مسجد میں معتکف ہے اور بیوی گھر پر ہے تو اس صورت میں مباشرت سے منع کرنا ایک بعید سی بات ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ مسجد میں معتکف آدمی کا اپنی بیوی سے مباشرت کے لیے گھر چلے جانے کا خدشہ تھا، اس لیے اعتکاف کے دوران مباشرت سے منع کیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ بات مسلمہ تھی کہ اعتکاف کے دوران کسی شرعی مجبوری کے علاوہ مسجد سے نہیں نکلنا چاہیے۔ اور یہ مسئلہ ہر کسی کے علم میں تھا کہ دوران اعتکاف بیویوں سے دور رہنا چاہیے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں:

''اعتکاف کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ اعتکاف کے دوران کسی کی بیمار پرسی یا کسی کے جنازے میں شرکت کے لیے بھی باہر نہ نکلا جائے اور نہ ہی بیوی سے ازدواجی تعلقات قائم کیے جائیں۔ کسی بہت ضروری کام (مجبوری) کے بغیر باہر نہ نکلا جائے۔'' (سنن أبي داود، رقم الحديث : ٢٤٧٣)

② ...... اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور ان کے صاحب زادے سیدنا اسماعیل علیہ السلام سے عہد لیا:

﴿اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَ الْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ﴾ [البقرة : ١٢٥]

''دونوں صاف رکھیں میرے گھر کو طواف، اعتکاف، رکوع اور سجود کرنے والوں کے لیے۔''

چونکہ اللہ تعالیٰ نے اعتکاف کا ذکر مسجد کے ساتھ خاص کیا ہے لہٰذا اعتکاف مسجد کے علاوہ کسی اور جگہ درست اور جائز نہیں ہے۔

۳...... امام زہری کہتے ہیں: مجھے عروہ اور عمرہ نے بیان کیا کہ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا مسجد میں جب اعتکاف کرتی تھیں تو اپنے گھر میں کسی انتہائی اہم ضرورت کے بغیر داخل نہیں ہوتی تھیں۔ آپ رضی اللہ عنہا رمضان المبارک کے آخری عشرے میں اعتکاف کیا کرتی تھیں۔

(السنن الکبری للنسائي : ۲/ ۲۵۸)

اس روایت میں سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا مسجد میں اعتکاف کرنا مذکور ہے۔

۴...... اور اسی طرح سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر رمضان میں اعتکاف کیا کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز پڑھنے کے بعد اپنے اعتکاف کے خیمہ میں جاتے تھے۔ (راوی کہتا ہے کہ) سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اعتکاف کی اجازت چاہی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اجازت دے دی، اس لیے انھوں نے بھی (اپنے لیے) ایک خیمہ لگالیا۔''

(صحیح بخاری، رقم الحدیث: ۲۰۴۱)

اس حدیث سے بھی یہ واضح ہوتا ہے کہ عورتیں اگر اعتکاف کریں تو مسجد ہی میں کریں۔ اگر مسجد کے علاوہ کسی اور جگہ، یعنی گھر میں اعتکاف جائز ہوتا تو جب سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے اجازت چاہی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرما دیتے کہ اپنے گھر میں ہی اعتکاف کرلو۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور مبارک یا خلفائے راشدین کے زمانے میں کوئی مثال ایسی نہیں ملتی کہ کسی خاتون نے اپنے گھر میں اعتکاف کیا ہو، لہٰذا اگر عورت اعتکاف کرنا چاہے تو وہ بھی مسجد ہی میں کرے گی، گھر میں اعتکاف کرنا جائز نہیں ہے۔

ضروری وضاحت:

اب تو خواتین نے بھی غلط روش اپنا لی ہے کہ اعتکاف کی غرض سے دور دراز شہروں کی مساجد میں خیمہ زن ہونے کا اہتمام کرتی ہیں جب کہ ایسا کرنا بالکل غلط اور ناجائز ہے۔ شریعت نے ہر کام کی ایک حد مقرر کررکھی ہے، لہٰذا ان حدوں کو پھلانگنا نہیں چاہیے۔ وہ عبادت کس کام کی ہے جس کا دوسرا پہلو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں ہو۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ گاؤں، قصبے اور شہروں کی مساجد میں جس طرح مردوں کے لیے اعتکاف کا انتظام کیا جاتا ہے اسی طرح عورتوں کے لیے بھی باپردہ، محفوظ ترین اور شرعی حدود کے تحت مکمل انتظام کرنا چاہیے۔ اگر کسی گاؤں یا قصبے کی مسجد میں خواتین کے لیے اعتکاف کا انتظام حالات کے پیش نظر کسی وجہ سے نہیں کیا گیا تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اس گاؤں یا قصبے کی خواتین دوسرے شہروں میں جا کر اعتکاف کریں۔ ہاں، اگر ان کا محرم، سرپرست یا (شادی شدہ ہونے کی صورت میں) خاوند ان کے ساتھ ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو پھر عورت کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی دوسرے شہر میں جا کر اعتکاف کرے کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کو محرم کے بغیر اکیلے کہیں جانے سے منع فرمایا ہے۔

مولانا محمد اکبر سلیم سعودی عرب میں ایک ٹریفک حادثے میں وفات پا گئے

مولانا محمد اکبر سلیم مہتمم مرکز ابن الخطاب الاسلامی الٰہ آباد ضلع قصور رمضان شریف میں بہ غرض عمرہ سعودی عرب تشریف لے گئے تھے۔ ۳؍اگست ۲۰۱۲ء جمعۃ المبارک کو اندوہ ناک اطلاع ملی کہ بروز منگل ان کا سعودی عرب میں ایک ٹریفک حادثے میں انتقال ہوگیا ہے۔ إنا للہ و إنا الیہ راجعون۔ مرحوم گوناگوں صفات کے حامل شخص تھے۔ جماعتی طور پر متحرک اور فعال تھے۔ ایک عظیم الشان مدرسہ مرکز ابن الخطاب الاسلامی الٰہ آباد ضلع قصور، ان کی ایک عظیم یادگار ہے۔ بچوں کی تعلیم وتربیت کے حوالے سے بھی ان کی خدمات شان دار تھیں۔ اپنے علاقے میں ہر دلعزیز تھے۔ مرکزی جمعیت اہل حدیث کے مرکزی راہنماؤں میں شامل تھے۔ مولانا موصوف کا اٹھ جانا یقیناً جماعت کا ایک بڑا نقصان ہے۔ اللہ کریم سے دعا ہے اللہ تعالیٰ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت الفردوس نصیب فرمائے۔ ان کے پس ماندگان، اہل جماعت، مرکز ابن الخطاب الاسلامی کے اساتذہ، طلباء و کارپردازان کو صبر جمیل عطا کرے۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ وادخلہ الجنۃ الفردوس. ادارہ الاعتصام لواحقین کے غم میں شریک ہے۔ (ادارہ)

تذکرہ علمائے اہل حدیث

مجاز اعظمی (۱۹۲۹ء- ۲۰۱۱ء)

ترے فراق سے ہے دیدۂ چمن نم ناک

اطہر افضال، نئی دہلی

۲۴ر دسمبر ۲۰۱۱ء کی کہر آلود صبح تھی، اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور راشد اخلاق نے یہ خبر دی کہ مجاز صاحب کا انتقال ہوگیا ہے۔ زبان سے انا للہ وانا الیہ راجعون نکلا اور ان کے لیے دعائے مغفرت اور بلندیِ درجات کے کلمات۔ خبر انہونی نہیں تھی کیوں کہ ان کی عمر اور بیماری کا سلسلہ اتنا طویل تھا کہ ہر دم یہ کھٹکا لگا رہتا تھا۔ لیکن جب تقدیر نے اپنا فیصلہ سنایا تو میں حیرت وحسرت سے در و دیوار کو تکتا رہ گیا ؏ شہر ناپرساں میں تیری چشم تر دیکھے گا کون

ذہن کے پردے پر گزشتہ دو دہائی سے زیادہ مدت کے واقعات رقص کرنے لگے۔ جامعہ عالیہ عربیہ میں پرائمری، منشی اور عربی کی تعلیم کے حوالے سے کلاس فیلوز اور اساتذہ سے وابستہ کہانیاں۔ کاغذ، کاپی اور کتابوں کے بیچ بیتے ہوئے مہ وسال، شوخی وشرارت اور آفس میں طلبی پر مجاز صاحب کی ہدایت، نصیحت اور کبھی کبھی تنبیہ، انجمن تہذیب البیان کی سرگرمیاں، تقریری اور تحریری مقابلے اور اس کے لیے گھنٹوں مجاز صاحب کے دفتر میں حاضری، کبھی ابتدائیہ لکھنے کی ضد اور کبھی کچھ عمدہ قسم کے اشعار کی فرمائش جن کو تقریر یا مقالے میں استعمال کر کے میدان مارا جاسکے۔ مجلّہ ''تہذیب'' کی تیاری وترتیب کے لیے مجاز صاحب کے سامنے معصوم تمناؤں کا اظہار، سچ پوچھیے تو ان کے بغیر ''تہذیب'' کا تصور ذرا ادھورا ادھورا لگتا ہے۔ آیئے! ذرا اِس نابغۂ عصر کے ذکرِ خیر میں کچھ لمحے بسر کیے جائیں تا کہ دماغ کو تازگی اور دل کو سرور ملے۔

جامعہ عالیہ عربیہ، مئو کی پرانی عمارت جہاں اس وقت مدرسہ عالیہ نسواں قائم ہے، کے مرکزی دروازے سے داخل ہوتے ہی بائیں جانب پہلے ہی کمرے کے دروازے پر ''دفتر'' کی نیم پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ کمرے کے داہنے گوشے میں ڈیسک پر نئی پرانی فائلوں کے بیچ جھکے ہوئے اور چھوٹے چھوٹے حروف میں کچھ لکھتے ہوئے ایک شخص نہیں بلکہ ایک شخصیت پر نظر پڑتی تھی۔ سفید کرتا پاجامہ اور کلاہ زیب تن کیے ہوئے، موسم سرما میں زمستانی ہوا سے بچنے کے لیے سیاہ رنگ کا اورکوٹ اور اسی رنگ کی ٹوپی، کام میں محو اور منہمک۔ آنے جانے والے کی گفتار اور رفتار سے بہ ظاہر بے پروا لیکن باخبر، وقفے وقفے سے کمرے کا جائزہ لیتے اور پھر کام میں مصروف۔ دفتر کیا تھا، مدرسے کا پورا نظام یہیں سے چلتا تھا، مطبخ میں کیا بنے گا اور آج کس لڑکے کا کھانا بند ہوگا، دارالاقامہ، طلباء اور اساتذہ کی چھٹی کے مسائل کے ساتھ ساتھ شہر میں مختلف مقامات پر ہو رہے تعمیراتی کاموں کی خبر۔ ناظم، اراکین، ہم دردانِ جامعہ اور مہمانوں کے قافلے آتے جاتے تھے، حساب کتاب کی بات ہوتی تھی، کبھی کبھی کی ذمے داران اور ملازمین کے درمیان نوک جھونک اور بحث وتکرار سے بھی شاید ان کے کام میں خلل نہیں پڑتا تھا۔ نام کیا تھا، نہیں معلوم لیکن لوگ ان کو نگراں صاحب کہتے تھے۔

اسّی کی دہائی میں نانا مرحوم حاجی محمد یاسین نے میرا بھی داخلہ اسی ادارے میں کرا دیا تھا جس کی وجہ سے روزانہ ان کو دیکھنے کا موقع ملتا تھا۔ وقت ہوا کے دوش پر اڑتا رہا اور میں بھی علم نہیں، درجے میں آگے بڑھتا رہا اور نہ جانے کب نگراں صاحب ہمارے لیے مجاز

صاحب ہوگئے اور بہت بعد میں یہ پتا چلا کہ یہی مولانا ابوالاسرار عبدالحکیم مجاؔز اعظمی رحمانی ہیں۔ گفتارِ دلبرانہ اور کردارِ قاہرانہ کے پیکر، اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل......!

مجاؔز صاحب کا خاندانی پس منظر علمی تھا۔ ان کے والد کا نام عبدالاحد تھا۔ ان کے اجداد میں ایک مولانا محمد سعید صاحب گزرے ہیں جو حضرت میاں نذیر حسین صاحب دہلوی کے شاگرد تھے۔ مجاؔز صاحب نو آبادیاتی عہد میں مئو کے ایک بنکر گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی پیدائش (تعلیمی کاغذات کے مطابق) ۱۹۲۹ء ہے۔ شہر کی روایتی صنعت پارچہ بافی سے ان کا بھی تعلق تھا اور کافی دنوں تک ان کے ہاتھوں نے کرگھے پر ساڑیاں تیار کی تھیں اور جب اسی ہاتھ میں قلم پکڑا تو صفحات پر ایسے ایسے شہ پارے بکھیرے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریروں کی یاد تازہ ہوگئی۔

مجاؔز صاحب کی ابتدائی تعلیم جامعہ عالیہ میں ہوئی تھی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے ۱۹۴۲ء میں دہلی کا رخ کیا۔ اس وقت تحریک آزادی آخری مرحلے میں داخل ہوچکی تھی۔ کانگرس نے ''بھارت چھوڑو'' کا نعرہ دیا تو مجاؔز صاحب مئو چھوڑ کر دہلی چلے گئے اور ان کا پڑاؤ تھا دارالحدیث رحمانیہ۔ جی ہاں، وہی رحمانیہ جہاں اپنے وقت کے بہترین اذہان اکٹھا ہوگئے تھے اور وہاں سے عاملینِ کتاب وسنت کی ایسی مقدس اور معتبر جماعت نکلی جس نے جدید ہندوستان میں دینی تعلیم وتربیت کے نظام کو آکسیجن عطا کیا۔ داخلے کے لیے مئو کے اس طالب علم کا امتحان صاحبِ مرعاۃ المفاتیح علامہ عبیداللہ رحمانی رحمہ اللہ نے اپنے وطن مبارک پور میں لیا تھا اور داخلے کی خوش خبری کے ساتھ دعاؤں کا تحفہ بھی دیا تھا جس نے عبدالحکیم کو مجاؔز اعظمی بنا دیا۔ تیسری جماعت میں داخلہ ہوا اور ہماری جدید قومی تاریخ کے ایک اہم سال ۱۹۴۷ء میں فارغ ہوئے۔ فراغت ہوئی تو کانگرس انگریزوں کو بھارت سے بھگانے میں کامیاب ہوگئی تھی اور مولانا عبدالحکیم نے بھی ''رحمانی'' کی نسبت کے ساتھ دہلی کو خیر باد کہہ کر وطن کی راہ لی کیوں کہ اب دہلی کی فضاؤں میں شگوفے نہیں شعلے برس رہے تھے۔

مجاؔز صاحب کی تعلیم اور فکر کی تشکیل میں اس ادارے کا کردار کافی اہم ہے۔ اس کی پاکیزہ اور علم وعمل سے بھرپور فضا میں انھوں نے مستقبل کی زندگی کا خاکہ بنایا اور کچھ تجربات بھی حاصل کیے۔ مضمون نگاری کا سلسلہ یہیں سے شروع ہوا، طلباء کی انجمن کے ناظم رہے۔ پہلا مضمون یہیں کے رسالے ''محدث'' کے لیے لکھا جس پر علامہ نذیر احمد رحمانی نے حوصلہ افزائی کی اور مستقل لکھنے کا مشورہ دیا اور اگلے بیس سال تک ان کا اشہب قلم پوری رفتار اور روانی سے دوڑتا رہا اور علمی دنیا سے خراج تحسین حاصل کرتا رہا۔ بعد میں رفتار کافی سست ہوگئی لیکن رعنائیِ نگارش برقرار رہی۔ مجاؔز صاحب رحمانیہ کے آخری فارغ التحصیل طلباء میں سے تھے، تقسیمِ ہند کے بعد اس ادارے پر خزاں کا ایسا موسم طاری ہوا کہ یہ پھر بہار نہ دیکھ سکا۔ مجاؔز صاحب نے شیخ الحدیث عبیداللہ رحمانی مبارک پوری اور علامہ نذیر احمد رحمانی سے حدیث کی کتابیں پڑھیں۔ مولانا عبیداللہ طالب مبارک پوری، مولانا عبدالجلیل رحمانی، مولانا اصحاب الدین پشاوری، مولانا محمد بشیر مبارک پوری، مولانا عبدالصمد حسین آبادی اور مولانا عبدالحلیم پشاوری بھی ان کے اساتذہ میں سے ہیں۔ مجاؔز صاحب شیخ الحدیث مبارک پوری سے زیادہ متاثر تھے اور ان کی علمی جلالت اور پاکیزہ نفسی کا کثرت سے ذکر کیا کرتے تھے اور استاد بھی شفقت فرماتے تھے۔ انھوں نے شیخ الحدیث کی وفات پر دو نظمیں لکھی تھیں جن میں استاد محترم کی غزارتِ علمی اور صدق وصفا سے عبارت زندگی کا نقشہ اچھے انداز میں کھینچا تھا۔

دہلی میں طالب علمی کے دوران مجاؔز صاحب نے پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل کا امتحان بھی پاس کیا اور ۱۹۴۶ء میں بھوپال تشریف لے گئے اور علامہ خلیل عرب سے بھی استفادہ کیا۔ وہیں پر ان کی ملاقات علامہ سیّد سلیمان ندوی سے ہوئی تھی۔ وہ اس ملاقات کا برابر ذکر کرتے رہتے تھے۔ میں نے مجاؔز صاحب کی زبانی علامہ خلیل عرب کی عربی میں صلاحیت اور بلاغت ومعانی میں ان کے درک کی تعریف بارہا سنی ہے۔

مجاؔز صاحب نے اپنی عملی زندگی کا آغاز جامعہ عالیہ سے کیا۔ ۱۹۴۷ء، ۴۸ کے دوران تدریسی خدمات انجام دیں لیکن ایک سال کے بعد پھر دہلی چلے گئے۔ اس وقت کاروانِ اہل حدیث کے خانماں برباد افراد کے تنِ نازک میں شاہین کا جگر پیدا کرنے کے نیک مقصد سے مولانا تقریظ احمد سہسوانی نے علامہ ثناء اللہ امرتسری مرحوم کی یاد میں مجلّہ ''اہل حدیث'' کا اجرا کیا تھا اور مجاؔز صاحب پھر ''بانداز دگر'' دہلی آ گئے تھے اور دو دہائی تک وقار و تمکنت کے ساتھ علم کی خدمت کرتے رہے۔ اس دوران انھوں نے نشیب بھی دیکھے اور فراز بھی لیکن اپنی وضع داری اور عزتِ نفس کو کبھی قربان نہیں کیا۔ بے باکی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا، اسلام کے تعارف اور تبلیغ کے لیے لکھا، جماعت کے دفاع میں لکھا اور دل سے لکھا، منصب کے وقار اور رحمانیہ کی تعلیم کا پاس رکھا اور خودداری پر آنچ نہیں آنے دی۔ ایک لمحے کے لیے بھی مفاد و مصلحت کے نخلستانوں میں آرام نہیں کیا بلکہ اصول وخودداری کے ریگستانوں میں جھلستے رہے یہاں تک کہ پاؤں کے چھالوں نے انھیں دہلی سے وطن کی جانب کوچ کرنے پر مجبور کردیا۔

تقسیمِ ہند کے روح فرسا سانحے کے بعد جب ہندوستان کے اہل حدیث حضرات نے خوابوں کی کرچیاں چن چن کر نئے عزم کے ساتھ جماعت کو زندہ کرنے کی کوشش کی اور ۱۹۵۳ء میں آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کا نقیب ''ترجمان'' منظر عام پر آیا تو کانفرنس کے صدر مولانا عبدالوہاب آروی نے مجاؔز صاحب کو ''ترجمان'' کی ادارت کے لیے دعوت دی اور وہ ۱۹۵۸ء تک اس سے وابستہ رہے، پھر کسی اختلاف کی وجہ سے الگ ہوگئے یا الگ کردیے گئے۔ مجاؔز صاحب کہا کرتے تھے کہ میں آفس سیکریٹری تھا لیکن وہ کچھ بھی کرنا پڑتا تھا جس کے لیے لوگ چپڑاسی رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ''ترجمان'' کے لیے اداریے لکھتے تھے، مضامین کی ایڈیٹنگ اور پروف ریڈنگ کے ساتھ ساتھ جماعتی رپورٹنگ اور اعلان بھی تیار کرتے اور کتابوں پر تبصرے بھی لکھتے تھے۔ اس کے بعد پریس سے لے کر پرچہ پوسٹ کرنے تک کے سارے کام وہی کرتے تھے۔ علمی اور غیر علمی مشاغل کے اجتماع کے باوجود انھوں نے اپنی ذمے داریاں سلیقے سے ادا کیں اور اس جماعتی آرگن کو معاصر دینی صحافت میں ایک اہم مقام عطا کیا اور بڑی بلندی تک پہنچایا۔

مجاؔز صاحب مدرس تھے، شاعر اور صحافی تھے لیکن صحافت اور شاعری ان کی شناخت تھی۔ جس وقت انھوں نے لکھنا شروع کیا تھا اس وقت دینی صحافت کے میدان میں عامر عثمانی، عبدالماجد دریابادی اور محمد عثمان فارقلیط کی تحریروں کے چرچے رہتے تھے۔ بہت جلد نوجوان مجاؔز اعظمی نے ان کے درمیان ایک مقام بنالیا۔ دینی رسائل کی خشکی کی شکایت عام بات ہے لیکن مجاؔز صاحب نے خالص فقہ وفتاویٰ اور اسلامی موضوعات میں شگفتہ اور رواں تحریریں پیش کیں۔ ان کے قلم کی رعنائی اور اسلوب کی شگفتگی ہر جگہ نظر آتی ہے۔ دینی مضامین ومقالات، اداریے، تعزیتی پیغامات، خطوط، اشتہارات وجنتری ہر جگہ ان کی تحریر کی خوبی اور خوب صورتی قارئین کو پرچاتی ہے۔ دو چار سطری نوٹ بھی لکھتے تھے تو لفظیات اور اسلوب واَدا سے پتا چل جاتا تھا کہ کس کی تحریر ہے۔ بلامبالغہ ان کا قلم ہر جگہ ابرِ بہاراں بن کے برسا ہے۔

اس وقت میرے سامنے ''ترجمان'' کے کچھ بوسیدہ شمارے ہیں جن میں ''لمعات'' کے عنوان سے ان کی تحریریں موتی کی طرح چمک رہی ہیں اور میں ان کو پڑھ کر محظوظ ہو رہا ہوں اور سوچتا ہوں ؏

ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی

ان کے اداریے ان کی مطالعے کی وسعت، تجزیاتی قوت اور گہری بصیرت کے آئینہ دار ہیں۔ ان کا ہاتھ نبضِ عصرِ رواں پہ رہتا تھا۔ اداریے کے مضامین وموضوعات کے انتخاب میں وہ ''ترجمان'' کی ترجیحات کے ساتھ علمی اور عوامی ضرورتوں کو بھی دھیان میں رکھتے تھے۔ اسلامیات وتاریخ کے ٹھوس اور گہرے مطالعے، عربی، فارسی اور اردو زبان وادب پر قابل رشک گرفت نے ان کی تحریروں کو علمیت اور شگفتگی عطا کی تھی۔ انھوں نے عقائد وعبادات کی بابت خود پیروانِ

اسلام کی مداہنت کا نوٹس لیا۔ برادرانِ وطن کی تنگ نظری اور تعصب کو کو آئینہ دکھایا اور ان کی اسلام مخالف حرکتوں کا پردہ چاک کیا۔ مشرق وسطیٰ میں ہو رہی تبدیلیوں کی طرف اشارہ کیا۔ سویت یونین کی مذہب مخالف پالیسیوں، اہل مغرب کی خطرناک مادیت پرستی اور خود پڑوسی ملک کے ''مردان با صفا'' کی جذبات فروشیوں پر بھی تنقید کی۔ ایک سعودی وزیر نے جب گاندھی جی کی سمادھی پر گلہائے عقیدت پیش کیے تو ان کا قلم خاموش نہ رہ سکا اور ''سیاسی پھول دین کے کانٹے'' کے عنوان سے اداریہ لکھا۔ بہ قول مولانا عبدالحمید رحمانی:

''تقسیم ملک کے بعد جن معدودے چند افاضل نے جماعت اہل حدیث میں بیداری کی لہر پیدا کی ان میں آپ (مجاز اعظمی) کا نام سرِفہرست ہے۔ صحافتی سطح پر عبدالماجد دریابادی سے لے کر عامر عثمانی تک، مجلّہ دارالعلوم دیوبند سے لے کر ''الحرم'' میرٹھ تک جس کسی نے مسلک اہل حدیث، تاریخ اہل حدیث اور علمائے اہل حدیث کے خلاف قلم اٹھایا مجاز صاحب کی گرفت سے بچ نہ سکا۔''

(التوعیہ، نئی دہلی، ص:۲۲، مارچ ۱۹۸۸ء)

مجاز صاحب ''لمعات'' کے عنوان سے اداریے لکھتے تھے جو مختلف موضوعات پر مشتمل ہوتے تھے۔ جی چاہتا ہے کہ چند اداریوں کے عناوین پیش کروں، آیئے! ان کی ایک جھلک دیکھیں، اس کے بعد چند اقتباسات کی بھی سیر کریں:

''ترجمان کا سال جدید، عید کیا لائی؟ مولانا مودودی اور نعرۂ جہاد۔'' (مئی ۱۹۵۶ء)

''تبلیغی جماعت کدھر؟ فرشتوں کی حکومت، اکبر اعظم کی برسی، دریاباد کی خشکی، آزادی ہی آزادی۔'' (جولائی ۱۹۵۶ء)

''ہر لب پہ آہ آہ ہر اک دل میں درد درد، بڑے بے آبرو ہو کر۔ مصر میں مذہبی اصلاحات، تحفظ ناموس رسول پر چر کے۔'' (اکتوبر ۱۹۵۶ء)

''اُردو میں نماز کہاں سے آئی؟ مذہب کے ذریعے انکارِ خدا کی آمد، تشہیر کرامات کا پس منظر، شاہ سعود کی سیاست، جرم رکتا نہیں ہے ڈالر سے۔'' (جون ۱۹۵۷ء)

مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنی کتاب ''محمد علی: ذاتی ڈائری کے چند اوراق'' میں محمد علی جوہر اور عبدالقادر صاحب قصوری کے درمیان غیر اللہ کی قسم کھانے کے موضوع پر اہل حدیث پر طنز کیا تھا۔ مجاز صاحب نے ''دریاباد کی خشکی'' کے عنوان سے ان کا علمی محاکمہ کیا تھا:

''غیر اللہ کی قسم کھانی حرام ہے، اس پر تنبیہ کرنی اگر اہل حدیثیت ہے تو مبارک ہے لیکن اس مقدس تنبیہ پر مذاق اڑانا ہی اگر ''تھانویت'' ہے تو ملت کے ہزار آنسو اس کی قسمت پر۔'' (ترجمان، دہلی، ص:۴، جولائی ۱۹۵۶ء)

ودیا بھون، بمبئی کی جانب سے شائع ہونے والی ایک عیسائی مصنف کی کتاب ''ریلجس لیڈرز'' کا تنقیدی جائزہ اس عنوان ''ہر لب پہ آہ آہ ہر اک دل میں درد درد'' سے لیا تھا۔ اس اداریے کی تمہید پڑھتے چلیں:

''ایک بار پھر ملتِ اسلامیہ درد و کرب سے چیخ اٹھی ہے۔ پتا نہیں زندگی میں کتنی بار تڑپنا اور لوٹنا پڑے گا۔ اگر ہماری یاد غلطی نہیں کرتی تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ آزاد ہندوستان کی نو سالہ زندگی میں دسواں گیارھواں حملہ ناموس رسول پر ہوا ہے۔ تیغ و تبر کے زخم کی ٹیس محدود ہوتی ہے کہ زخم کھایا اور ابدی نیند سو گئے لیکن ایک ایسا بھی زخم ہوا کرتا ہے جس کو دیکھا تو نہیں جاسکتا پر درد و کرب کا عالم یہ ہوتا ہے کہ ہر لمحہ جیتے جی موت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔''

(ترجمان، دہلی، ص:۲، اکتوبر ۱۹۵۶ء)

''مصر میں مذہبی اصلاحات'' کے عنوان سے جمال عبدالناصر کی کوششوں کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مصر عربی ممالک میں سب سے زیادہ ماڈرن اور مغربی تہذیب کا دل دادہ مانا جاتا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ

مصر میں مغربی تہذیب کو خوب خوب گلے لگایا گیا ہے لیکن اب مصر کی آنکھیں کھل رہی ہیں کہ مغربی تہذیب نے تو مصر کو سادہ باغِ بہشت سے نکال کر رنگین جہنم میں ڈال دیا تھا۔'' (ترجمان، دہلی، ص:۵، اکتوبر ۱۹۵۶ء)

۱۹۵۵ء میں شاہ سعود کی ہندوستان آمد پر آپ نے ''ترجمان'' کا جو ''شاہ سعود نمبر'' شائع کیا تھا اس کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔ ''ترجمان'' میں ''ادارہ'' کے نام سے شائع ہونے والی تحریریں بھی مجاز صاحب ہی کے قلم سے ہوا کرتی تھیں۔ وہ مضامین پر بہ وقت ضرورت ادارتی نوٹ بھی لگاتے تھے۔ ''خاندان نجد کے ایک مومن کا پیغام مسلمانانِ عالم کے نام'' مطبوعہ مضمون کا ادارتی نوٹ پڑھیے اور سر دھنیے:

''صحرائے نجد میں لیلائے توحید اور سلمائے حقانیت کے لیے جس قیس نے سر دھڑ کی بازی لگائی تھی اس کی یادگار قیس بن عامر کی طرح افسانوی رنگ میں نہیں بلکہ تخت وتاج کے ساتھ حقیقی شکل میں آج ''حکومت سعودیہ'' کے عنوان سے موجود ہے۔ اس قیس مقدس سے ہماری مراد شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب نجدی کی ذات ہے۔''

(ترجمان، دہلی، ص:۱۳، اکتوبر ۱۹۵۶ء)

اداریوں کے ساتھ ذرا ایک آدھ خطوط کی بھی کچھ عبارتیں پڑھتے چلیں۔ یہاں بھی ان کے قلم کی رعنائی اور اسلوب کی شگفتگی کی وہی سج دھج ہے۔ مکمل خط پیش نہ کرکے میں نے صرف اسی حصے کے انتخاب پر اکتفا کیا ہے جس سے مجاز صاحب کے اسلوب کی ایک جھلک سامنے آتی ہے۔ خطوط بھی ان کی عربی وفارسی ادب شناسی کی شہادت دے رہے ہیں۔ ذیل میں مذکور دونوں خطوط ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری کے نام ہیں اور موضوع جامعہ عالیہ عربیہ ہے:

❀......''السلام علیکم۔ امید ہے کہ آپ ہر طرح بہ عافیت ہوں گے۔

محترم! مدرسے سے آپ کو بڑی توقعات ہیں۔ یہ تسلیم ہے کہ آپ کو بعض باتوں سے صدمہ یا رنج پہنچا ہے مگر رفع درگزر کا یہ انداز کتنا پیارا ہے

وفا کنیم، ملامت کشیم، خوش باشیم
کہ در طریقت ما کافریست رنجیدن''

(مجاز صاحب کا خط ازہری صاحب کے نام، ۱۷ رمئی ۱۹۷۹ء)

❀......''السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مزاج بخیر۔ گزارش ہے کہ آپ مدرسہ عالیہ کے لیے جو گداز قلب رکھتے ہیں اور اس کے لیے وقتاً فوقتاً جو خدمات انجام دیتے ہیں، مدرسہ اس کے لیے ہمیشہ شکر گزار رہے گا۔ امسال مدرسہ عالیہ کی طرف سے چند طلباء کی درخواستیں جامعہ اسلامیہ، مدینہ جا رہی ہیں۔ آپ وہاں کے مبعوث اور مزید برآں مدیر ہیں۔ اگر چند سطری ایک توصیہ تحریر فرمادیں تو مدرسہ کے لیے فال نیک اور باعث کامیابی ہو۔ امید ہے کہ متنبّی کے "إذا جعل الإحسان غير ربيب" پر خوش آئند تضمین کے لیے آپ کی عنایات فراواں ہوگی اور مدرسہ آپ کا احسان مند ہوگا۔''

(مجاز صاحب کا خط ازہری صاحب کے نام، ۱۹ راپریل ۱۹۸۱ء)

لگے ہاتھوں ایک تعزیتی پیغام بھی دیکھ لیں جو استادِ محترم ڈاکٹر رضاء اللہ مبارک پوری کی وفات پر لکھا گیا تھا اور ''محدث'' کے خصوصی شمارے میں شامل ہے۔ مجاز صاحب کی اس تحریر کو ذرا رک رک کے پڑھیے، الفاظ کے دروبست اور تراکیب کی معنویت پر غور کیجیے:

''جامعہ عالیہ عربیہ کے ایک صدی سے جس خانوادہ کے عظیم سرپرست کے ساتھ علمی استفادے کے تعلقات رہے ہیں آج اس کی تیسری کڑی مولانا ڈاکٹر رضاء اللہ مدنی کی جدائی ادارے کے جملہ اراکین اور متوسلین کے لیے بڑی سوہان روح ہے۔ محدث کبیر مولانا ابوالعلی عبدالرحمٰن مبارک پوری صاحبِ تحفۃ الاحوذی سے جامعہ کو اتنی عقیدت تھی کہ ادارے کی پہلی روداد میں آپ کا معائنہ تاریخی حیثیت رکھتا ہے اور

مرورِ زمانہ کے بعد ان کے حفید شہیر مولانا رضاء اللہ نائب امیر مرکزی جمعیۃ اہل حدیث (ہند) اور شیخ الجامعہ السّلفیہ (بنارس) نے اپنے جدِ امجد کی یاد علمی دنیا میں تازہ کردی۔ افسوس ابھی پانچویں دہائی میں عمر عزیز گزر رہی تھی کہ قضائے الٰہی نے ہم سے چھین لیا۔

آسمان پر ستارے ہزاروں طلوع ہوتے ہیں اور ان کی کچھ جھلک بھی رہتی ہے لیکن ماہِ تاباں کی روشنی عالم گیر ہوتی ہے۔ مولانا مرحوم ملتِ اسلامیہ کے لیے علمی، فکری اور ثقافتی حیثیت سے ماہِ مبین کی حیثیت رکھتے تھے اور اس کی آخری منزل کی طرف رواں دواں تھے کہ دوران سفر اللہ کو پیارے ہوگئے اور آپ کی وفات بھی دین کی راہ میں سفرِ غربت میں ہوئی اور یہ شعر صادق آتا ہے ۔

مل کے خاروں سے دشت غربت میں
آبلے پھوٹ پھوٹ کر روئے

علالت میں بھی بے چین دل نے دین کی راہ میں طویل سفر کا حوصلہ دیا اور دورانِ سفر مولانا رضاء اللہ ہم سے جدا ہوگئے اور رضائے الٰہی سے ہم کنار ہوئے۔ اس دردناک سانحے پر جامعہ عالیہ عربیہ (مئو) کے اراکین، اساتذہ، طلباء اور تمام متعلقین باچشم نم مجسم تعزیت ہو کر مرحوم کے لیے رفع درجات کی اور خانوادۂ مرحوم کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتے ہیں اور ان کے نعم البدل کے لیے بھی قاضی الحاجات سے التجا کرتے ہیں۔''

(محدث، بنارس، جون تا ستمبر ۲۰۰۳ء، ص:۳۲)

میں نے متعدد اقتباسات اس لیے چنے ہیں کہ نئی نسل کو اندازہ ہو کہ ان کی تحریروں کی شان کیا ہوتی تھی اور ہر میدان میں ان کا قلم کتنے اعتماد سے رواں رہتا تھا۔ ہوسکتا ہے اسی بہانے کچھ لوگوں کو چند لائبریریوں میں محفوظ ان کرم خوردہ رسائل کو بھی پڑھنے کی توفیق ہو۔

مجازؔ صاحب نے کلاسیکی ادب کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ ان کا ادبی ذوق نہایت اعلیٰ اور علمی شعور کافی بالیدہ تھا۔ وہ اردو، عربی اور فارسی ادبیات شناسی میں بہتوں پر فائق تھے۔ الفاظ کے برمحل استعمال، حسنِ انتخاب اور مضامین کو نادر عناوین عطا کرنے میں لاثانی تھے۔ اردو مضامین میں عربی اور فارسی کے محاورات اور ضرب الامثال اتنے کمال اور سلیقے سے جڑ دیتے ہیں کہ قاری بہت دیر تک ان کی جمالیاتی فضا کا اسیر ہوکر رہ جاتا ہے۔ ان کی تحریروں میں تخلیقیت، اصالت اور شگفتگی کی چاندنی چھٹکی نظر آتی ہے۔ انھوں نے کم لکھا لیکن جو بھی لکھا معیاری لکھا۔ ان کی تحریریں ادبی اور علمی نثر کا عمدہ نمونہ ہیں۔ ان کے مضامین اور اداریے کے عناوین بڑے تیکھے اور فکر انگیز ہوا کرتے تھے۔ اشعار کا استعمال ایسے سلیقے سے کرتے کہ گویا شاعر نے اسی مقام کے لیے کہا ہو، اور اردو کے ساتھ فارسی اور کبھی عربی کے بھی۔

مجازؔ صاحب کو پڑھتے وقت مولانا ابوالکلام آزاد شدت سے یاد آتے۔ انھوں نے ''تذکرہ'' اور ''غبار خاطر'' کے اسلوب کا کامیاب تتبع کیا ہے۔ بلا مبالغہ مجازؔ صاحب نے اردو صحافت کے اس معیار کو برقرار رکھا جس کو ابوالکلام نے متعارف کرایا تھا لیکن بدقسمتی سے اردو کی دینی صحافت کو ان کی سرپرستی بہت دیر تک نصیب نہ ہوسکی، سبب جو بھی رہا ہو لیکن اس سے جو علمی نقصان ہوا اس کی تلافی بہت مشکل ہے۔ فضا صاحب نے اپنی نظم ''نیاز؛ صدآہنگ ساز'' میں نیاز فتح پوری کے طرز نگارش کے بارے میں جو کہا تھا آج وہ اشعار مجھے مجازؔ صاحب کے حوالے سے یاد آرہے ہیں، آپ بھی پڑھیے ۔

ہے تجھ پہ ختم، طرز نگارش کی یہ روش
تیرے قلم کا کوئی تتبع نہ کرسکا
کس کو ملی شعور کی یہ داخلی تپش
ہیرے کی روح تُو نے سموئی ہے کانچ میں
سورج نہ کوئی اپنے افق سے ابھر سکا

(شعلۂ نیم سوز، فضا ابن فیضی، ص:۲۶۷)

مجازؔ صاحب ''ترجمان'' سے علاحدگی کے بعد جماعت اسلامی کے آرگن ''دعوت'' سے وابستہ ہوگئے تھے۔ اس میں مضامین کے

ساتھ ''کوہ پیا'' کے عنوان سے روزانہ ایک قطعہ بھی لکھتے تھے جس میں ملک کے سیاسی حالات پر تبصرہ ہوتا تھا۔ اسی دوران آپ نے معاشرتی اور تاریخی موضوعات پر کچھ کتابیں بھی لکھیں جیسے آثارِ نبوت، روح نماز، اسلامی زندگی، ہدایت نامہ مسلمان بیوی، ہدایت نامہ مسلمان شوہر، خلیفۂ اسلام اول، عمر فاروق اور روحانی عورت۔ انھوں نے کچھ عربی مضامین کے اردو ترجمے بھی کیے جو ''ترجمان'' میں شائع ہوئے اور دعوت کے ایک خصوصی نمبر میں ان کا ایک مضمون ''شاہراہ نبوت کے چند روڑے'' کے عنوان سے چھپا تھا۔ انھوں نے ''الجمعیۃ'' دہلی کے لیے بھی لکھا تھا۔ ''روحانی عورت'' کا انگریزی ترجمہ امریکا میں شائع ہوا تو میں نے مجاؔز صاحب کو سنایا۔ ایک کرب آمیز تبسم کے ساتھ فرمایا: ''جنگل میں مورنا چا، کس نے دیکھا۔''

غالباً ۲۰۰۶ء کی بات ہے، میں کتابوں کی خریداری کے سلسلے میں دارالاشاعت نظام الدین (دہلی) میں کتابیں الٹ پلٹ رہا تھا کہ اچانک ''روحانی عورت'' کا نیا ایڈیشن نظر آیا جس پر مصنف کی حیثیت سے نام تھا: مولانا مجاؔز اعظمی مرحوم۔ میں نے اس غیر ذمے دار ناشر سے کہا کہ مولانا مجاؔز اعظمی مرحوم نہیں با حیات ہیں، انھوں نے معذرت کی اور اگلے ایڈیشن میں اصلاح کا وعدہ کیا۔ میں نے کہا کہ مجاؔز صاحب عمر کے جس مرحلے میں ہیں، بہتر ہوگا کہ آپ اگلی اشاعت کے وقت تصدیق کرلیں کہ کہیں مجاؔز حقیقت میں تو مرحوم نہیں ہوگئے۔ میں نے یہ واقعہ مجاؔز صاحب کو سنایا۔ ان کی تاب ناک پیشانی پر چند سلوٹیں نمودار ہوئیں جن کا مفہوم میں نہیں سمجھ سکا اور میری معلومات میں اضافے کی غرض سے گویا ہوئے:

دہلی میں قیام کے دوران میں نے کئی ایک کتابیں لکھی تھیں جن میں ایک آدھ کتابیں دوسرے کے نام سے چھاپ دی گئیں۔ اس ضمن میں وہ ایک برزگ عالم کا نام لیا کرتے تھے جن کی خطابت کے خوب چرچے تھے۔ ناشروں نے ان کی کتابیں چھاپ کر پیسے کمائے لیکن اپنے فائدے میں مصنف کو یاد نہیں رکھا۔ وہ انتہائی کرب کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ حق المحنت ادا کرنا تو دور کی بات ہے نہایت دیدہ دلیری سے بلا اجازت کتابیں چھاپی جارہی ہیں اور بعض بدباطن تو مصنف کا نام بھی کسی ''کم سن قلم کار'' سے بدل دیتے ہیں۔ ان کو اس بات کا اندازہ تو ضرور رہا ہوگا کہ ''پبلشنگ مافیا'' کتنی تیزی سے پھیلتا جا رہا ہے، اسی لیے تو آخری دنوں میں کہا کرتے تھے کہ بس کتابیں کسی طرح شائع ہوجائیں۔ مکتبہ الفہیم (مئو) نے ''آثارِ نبوت'' کا نیا ایڈیشن کچھ سال پہلے شائع کیا تھا، دیکھیے بقیہ کتابوں کا کیا حشر ہوتا ہے۔

مجاؔز صاحب نے قسطوں میں دہلی میں تقریباً تین دہائیاں گزاری تھیں، یہیں پر افتاد سیکھی اور پرواز بھی۔ قیامِ دہلی کا ذکر خوب کرتے تھے لیکن ان کی پوری گفتگو ''میں'' سے خالی ہوتی تھی لیکن عبرت، عظمت اور دل آویزی سے پر ہوتی تھی۔

جماعت کے سلسلے میں اس وقت کے نوجوانوں کے جو جذبات تھے، ان کے اندر شباب اور شعور کے آمیزے سے جو انقلاب جنم لے رہا تھا اس کی تفصیل میں نے انھی کی زبانی سنی۔ چاندنی چوک اور مینا بازار کی کہانی سناتے تھے۔ بتایا کرتے تھے کہ ہم لوگ کبھی کبھی پیدل پرانی دلی سے جامعہ ملیہ اسلامیہ جاتے تھے۔ انھوں نے دہلی میں ایک بھرپور زندگی گزاری تھی۔ علماء اور دانش وروں سے ان کے تعلقات تھے۔ ادبی محفلوں اور علمی مجلسوں سے سیکھا بھی اور سکھایا بھی۔ سیاست، صحافت، ادب اور ثقافت کے میدان سے وابستہ عظیم ہستیوں سے ان کی رسم وراہ تھی۔ حفظ الرحمان سیوہاروی، عثمان فارقلیط، عطاء اللہ شاہ بخاری اور جنرل شاہ نواز کا نام میں نے بارہا ان کی زبان سے سنا۔ شاہ بخاری کے بارے میں بتایا کرتے تھے کہ ایک بار انھوں نے مئو کا دورہ کرنے کے بعد دہلی کے ایک اجتماع میں بنکروں کے اس شہر کا حوالہ دیتے ہوئے کہا تھا:

''میں اعظم گڑھ کے ایک چھوٹے سے قصبے سے آرہا ہوں جہاں درجنوں ایسے علماء ہیں جو آستین چڑھا کر نہایت اعتماد کے ساتھ صحیحین کا درس دے سکتے ہیں۔''

میں نے مجاؔز صاحب کے دہلوی رفقاء سے ان کی اس وقت کی

کہانی سنی ہے جب 'آتش جوان تھا' جینے اور بہت کچھ کرنے کی امنگ تھی، وہ محفلوں کی شان تھے۔لیکن دہلی کیا چھوٹی کہ وہ اداس ہوگئے، امنگ رخصت ہوگئی اور نشاط کی کہانیاں داستان پارینہ بن گئیں، بہ قول مولانا رحمانی:

''ہماری جماعتی ناقدری اور حوصلہ شکنی کی ایک مثال مولانا مجاؔز رحمانی بھی ہیں۔''ترجمان'' سے علیحدگی کے بعد کچھ دنوں مختلف اشاعتی اداروں سے وابستہ ہوکر وہ دہلی میں رہے۔آخر نامہرِی جماعت سے مایوس ہوکر وہ دہلی سے اس طرح گئے جیسے دہلی سے ان کا کوئی رشتہ نہ رہا ہو۔''

(التوعیہ، دہلی، ص:۲۲، مارچ ۱۹۸۸ء)

مجاؔز صاحب دہلی میں اپنے ساتھ پیش آنے والے ''مخصوص حالات'' سے بد دل تو تھے ہی، ادھر ذاتی حادثے نے بھی ان پر کافی گہرا اثر ڈالا تھا۔۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۹ء کے درمیان ان کی ایک بیٹی اور تین بیٹے یکے بعد دیگرے چند مہ وسال کاٹ کر ہی دنیا سے چلے گئے، بن کھلے مرجھا جانے والے غنچوں نے ان کو احساس محرومی سے دوچار کردیا تھا۔ان کی صرف ایک بیٹی بشریٰ نے بھرپور زندگی پائی اور اب ان کے بچے بھی جوان ہیں اور شادی شدہ بھی۔اس حادثے نے ان کو کافی متاثر کیا تھا لیکن وہ تقدیر کے فیصلے سے راضی تھے اور کبھی شکوہ نہیں کیا۔لیکن ان کے تبسم کے پیچھے جو کرب چھپا تھا اس کا کبھی کبھی اندازہ ہوجاتا تھا ؂

ہم نے ہنس ہنس کے تری بزم میں اے پیکر ناز
کتنی آہوں کو چھپایا ہے تجھے کیا معلوم

مجاؔز صاحب جتنے بڑے عالم تھے، اتنے ہی اعلیٰ صفات کے حامل انسان تھے۔نرم گفتار اور شگفتہ مزاج تھے۔بڑی صاف اور شفاف زندگی بسر کی۔ہٹو بچو کے کلچر سے تو بالکل ناواقف تھے۔دہلی جیسے شہر میں بھی عمر کا ایک حصہ گزارنے کے باوجود وہ سیلف پروجیکشن کے ہنر سے عاری ہی رہے۔وہ خاموش طبع، نیک طینت اور صاف طبیعت کے انسان تھے۔مجھے ان کی شخصیت میں گہرے سمندر کا سکوت دکھائی دیتا تھا۔ان کی فکر میں وسعت تھی، مزاج اور رویے میں لچک لیکن عقیدے میں پختگی، مسلکی صلابت تھی لیکن تنگ نظری نہیں تھی۔وہ زاہد خشک نہیں، ایک زندہ دل، یار باش اور مرنجاں مرنج طبیعت کے حامل تھے۔ان کے خمیر میں طنز وظرافت شامل تھی۔مختصر انداز میں ایسی بات کہہ جاتے کہ مخاطب لاجواب ہوجاتا تھا۔ان کی ''حکیمانہ شوخیاں'' ان کی ظرافت طبع اور بذلہ سنجی پر دلالت کرتی تھیں۔آسمان علم پر ہونے کے باوجود وہ زمین سے جڑے رہے۔مئو کے ماحول میں انکسار اور اخلاص ان کی پہچان بن گئے تھے۔مولانا عبدالوحید سلفی کی وفات پر انھوں نے ایک نظم ''سایۂ افسردگی'' لکھی تھی جس کا ایک شعر یہ ہے ؂

منصب عز و شرف پر وہ مثالی انکسار
ایسے کم ہوں گے یہاں جو خود کو کم دیکھا کریں

میں جب اس شعر کو پڑھتا ہوں تو مجھے شاعر بری طرح یاد آتا ہے کیوں کہ علمی مرتبے کے باوجود ان کے اندر جو انکسار تھا اس کو مثالی ہی کہا جاسکتا ہے۔

جامعہ عالیہ میں ان کی جو جگہ اور جو کام تھا اس سے بہتوں کو ان کی علمی حیثیت کا صحیح صحیح اندازہ نہیں ہو پاتا تھا لیکن باذوق حضرات ہمیشہ ان کے حلقہ بہ گوش رہے۔فضا ابن فیضی کی زبان سے میں نے بارہا مجاؔز صاحب کی علمی وسعت اور برجستہ گوئی کا اعتراف سنا ہے۔کبھی کبھی ادب وشعر کے متعلق سے کوئی بات ہوتی تھی تو کہا کرتے تھے کہ ذرا ایک بار مجاؔز صاحب سے بھی سمجھ لیجیے گا۔ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری، جن کی علمی صلاحیت اور علمی خدمات کا ایک عالَم ثنا خواں ہے، وہ مجاؔز صاحب کی تبحر علمی کے قائل وقتیل تھے۔وہ کہا کرتے تھے مجھے فخر ہے کہ میں اس شہر سے تعلق رکھتا ہوں جہاں فضا ابن فیضی اور مجاؔز اعظمی پیدا ہوئے۔

علامہ عطاء اللہ حنیف بھوجیانی جیسے محدث نے ان کو ''الاعتصام'' لاہور کی ادارت کے لیے خود دعوت دی تھی لیکن ان کی گفتار اور انداز سے کبھی بھی ایسا نہیں لگتا تھا کہ وہ اتنے بڑے عالم ہیں۔ان کی انشا

پردازی کا اعتراف تو اچھے اچھے لوگوں نے کیا لیکن ان سب کے باوجود میں نے کبھی ان کی زبان سے تعریف نہیں سنی۔ ان کے اندر قناعت تھی۔

مجآز صاحب سے میری آخری ملاقات ۵رستمبر ۲۰۱۱ء کو ان کے گھر پر ہوئی تھی اور اس وقت ان کی صحت اچھی تھی۔ ڈھیر ساری باتیں ہوئیں۔ میری موجودہ مصروفیت پر خوشی کا اظہار کیا اور کہا کہ تم شروع سے مسلسل آگے بڑھنے پر یقین رکھتے ہو۔ لیکن میرے اندر قناعت ہے، وہی قناعت جس کی جانب ابوالعلاء معری نے اشارہ کیا تھا۔ اس دن عزیزم عبدالرحمٰن محمد یحییٰ (کنگ سعود یونیورسٹی، ریاض) بھی ساتھ میں تھے اور چند باتوں کو نوٹ کرلیا تھا، ان کے شکریے کے ساتھ معری کے یہ اشعار پیش کررہا ہوں، جو مجآز صاحب نے سنائے تھے ۔

أفوق البدر يوضع لي مهاد
أم الجوزاء تحت يدي وساد
قنعت فخلت أن النجم دوني
و سيان التقنع و الجهاد

''کیا میرا بستر چاند پر سجایا جائے گا؟ کیا جوزاء کو میرا تکیہ بنایا جائے گا؟ میں نے قناعت کی تو میں نے خیال کیا کہ ستارے مجھ سے کم تر ہیں اور میرے لیے قناعت اور جہاد دونوں ہم پلہ ہیں۔''

مجآز صاحب ایک علم دوست انسان تھے۔ لوح وقلم کی پرورش میں ان کی زندگی گزری تھی لیکن جامعہ عالیہ کی لائبریری کے لیے جب بھی نئی کتابیں خریدنے کی بات ہوتی تھی وہ کہا کرتے تھے کہ لائبریری میں جتنی کتابیں ہیں سب پڑھ چکے ہیں کیا۔ ان کی اس دلیل پر بہتوں کی بھنویں تن جاتی تھیں اور وہ کہتے تھے کہ یہ بات ان کی عالمانہ شان کو زیب نہیں دیتی ہے۔ لیکن اس سچ کے پیچھے کا کرب کسے معلوم تھا۔ درحقیقت ان کی یہ سوچ اسی مخصوص ماحول کی پیداوار تھی جہاں مطالعہ کرنے کا رواج ہی نہیں تھا۔ کتنے لوگ درسی کتابیں بھی بغیر مطالعے کے غلط سلط عبارتیں پڑھ کر بس جیسے تیسے خواندگی کی مقدار پوری کردیا کرتے تھے اور یہ سب مجآز صاحب اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے، اسی لیے جب بھی نئی کتاب کا مطالبہ ہوتا تو وہ ہمیشہ اپنا پرانا جملہ ہی دہراتے تھے۔ مئو کے مدارس کے اساتذہ کے درمیان مطالعے کے بے رغبتی کا ذکر میں نے وہاں پبلشروں سے بھی سنا ہے۔ اقبآل کو شکایت تھی ع ''کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں'' لیکن اب تو معاملہ الٹ گیا ہے ''صاحب کتاب'' تو ہیں لیکن ''کتاب خواں نہیں۔'' میرا خیال ہے کہ اس ضمن میں مجآز صاحب سے اتنی زیادتی ضرور ہوئی کہ انھوں نے ان باذوق، باصلاحیت اور ایمان دار اساتذہ کے جذبات کی بھی رعایت نہیں کی جن کی کاوشیں اور قربانیاں بہ ہر حال قابل تعریف ہیں اور ان کے اجلے دھندلے نقوش بھی نظر آرہے ہیں۔

میں تقریباً دو دہائی تک ان کے کافی قریب رہا اور کافی مدت جامعہ عالیہ میں زیر تعلیم بھی رہا لیکن مجآز صاحب سے صرف چھے مہینے تک پڑھنے کا موقع ملا۔ عربی کی پانچویں جماعت میں ایک کتاب پڑھائی جاتی تھی ''تلخیص المفتاح'' اور صرف یہی کتاب پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ پڑھاتے وقت جب وہ ''جرجانی'' اور ''سکاکی'' کہتے تھے تو ان کے لہجے میں ایک خاص قسم کا علمی جلال ہوا کرتا تھا جو ان دونوں شخصیات کے نبوغ اور عبقریت کی طرف اشارہ کرتا تھا۔ ابھی کتاب کے پانچ چھے صفحے ہی پڑھا پائے تھے کہ ششماہی امتحان کا وقت آگیا۔ میں نے ایک خاص ارادے سے پوچھا کہ خواندگی کی اتنی مختصر مقدار میں آپ امتحان کے لیے سوالات کیسے تیار کریں گے؟ فوراً دبیز عینک کے عقب سے ان کی ذہین آنکھیں نمودار ہوئیں اور لب پر زہرخنداں بکھیرتے ہوئے جواب دیا: یہ تو امتحان گاہ ہی میں پتا چلے گا۔ اور سچ بات ہے کہ سوال ہی نہیں سمجھ میں آرہا تھا، جواب کیا خاک دیتے۔

مجآز صاحب نے ۱۹۶۹ء میں جامعہ عالیہ جوائن کیا تھا۔ ابتدا میں دفتری امور دیکھتے تھے، پھر تدریسی خدمات پر بھی مامور ہوئے اور عقیدہ، تفسیر اور ادب وبلاغت کی کتابیں پڑھائیں۔ اسی دوران کلیہ فاطمۃ الزہراء للبنات میں ۱۹۸۲ء تا ۱۹۸۵ء تدریسی خدمات انجام

دیں۔ ارباب جامعہ کو ان پر بڑا اعتماد تھا۔ انھوں نے ایک کم نصف درجن نظماء کا دور دیکھا، جامعہ کے لیے ان کے کا اخلاص ہر چیز سے بالاتر تھا، وہ بعض معمولی چیزوں میں بھی جامعہ کے مفاد کو بالاتر رکھتے تھے جس پر کبھی کبھی طلباء اور اساتذہ ناراض ہوجاتے تھے۔ وہ جس جگہ پر تھے اگر غلطی سے بھی ان کو ''ہر دل عزیز'' بننے کا شوق سما گیا ہوتا تو پھر کم ظرف لوگ اپنے ساتھ ان کو بھی لے ڈوبتے۔ اس دوران جامعہ نے تعلیمی اور تعمیراتی لحاظ سے کافی ترقی کی۔ مئو کے مشرقی حصے میں لڑکیوں اور لڑکوں کی دینی اور عصری تعلیم کے ساتھ صحت عامہ کے میدان میں بھی جا بجا اس کے نمونے نظر آتے ہیں۔ ترقی کے اس سفر میں ماسٹر نثار احمد انصاری مرحوم، مولانا محمد اعظمی، حبیب الرحمان پہلوان، محمد ابراہیم، فخر الدین اور مولانا مظہر حسن ازہری کے ساتھ ہر جگہ مجاز صاحب موجود رہے اور اپنے علم اور قلم کی طاقت اور تجربے سے جامعہ کے کاموں میں رنگ بھرا۔ جہاں تک معیار کی بات ہے، اس کو بڑے بڑے ادارے محفوظ نہیں رکھ سکے تو ایک عالیہ کا کیا شکوہ۔ جامعہ کے لیے انھوں نے بہت کچھ کیا لیکن ایک کسک بہ ہرحال رہ گئی کہ انھیں ''کچھ اور'' کرنا چاہیے تھا۔ نقوی صاحب کہا کرتے تھے کہ جس آدمی کو شیخ الحدیث ہونا چاہیے تھا، اس سے ایک اکاؤنٹینٹ کا کام لیا گیا۔ لیکن جامعہ میں ان کی موجودگی سے باذوق طلباء اور اساتذہ کو کافی فائدہ ہوا۔ وہاں کے طلباء نے دینی تعلیم کے ساتھ جدید دانش گاہوں میں جو جگہ بنائی اس کے لیے انتظامیہ کی دور اندیشی اور تدبر کی داد دینی چاہیے۔ جامعہ کے یونیورسٹی سے الحاق پر ایک رائے نہیں تھی، یونیورسٹی میں زیر تعلیم عالیاوی فضلاء کو وہاں کے بعض اساتذہ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے، یہ الگ بات ہے کہ اب وہی لوگ اپنی اولاد کے داخلے کے لیے سفارش کرتے ہیں۔ جہاں تک مجھ کو یاد ہے مجاز صاحب نے کبھی اس تبدیلی کی حوصلہ شکنی نہیں کی اور بات چیت اور برتاؤ سے بھی ایسا محسوس نہیں ہوا۔

''دیر آید'' ہمیشہ ''درست آید'' نہیں ہوتا، یہ بات ''افکارِ عالیہ'' پر بھرپور صادق آتی ہے۔ ماسٹر نثار احمد انصاری مرحوم کی نظامت کے آخری ایام میں جامعہ سے ایک اردو مجلّے کی اشاعت کی بات تقریباً مکمل تھی لیکن کسی وجہ سے اس پر عمل نہیں کیا جاسکا۔ اس وقت سبب ذکر کرنے سے کچھ بھی حاصل نہیں ہے لیکن اس نیک تجویز پر عمل نہ ہونے سے علم وادب کا نقصان تو بہ ہرحال ہوا۔ اس وقت اگر مجلّہ منظر عام پر آ گیا ہوتا تو نئی نسل کو مجاز اعظمی کے قلم سے کچھ افکار تازہ پڑھنے کا موقع مل جاتا لیکن ارباب جامعہ کا خواب اس وقت شرمندۂ تعبیر ہوا جب آفتاب صحافت مجاز اعظمی کے ہاتھوں میں لرزہ طاری ہوگیا تھا، پھر بھی انھوں نے ۲۰۰۴ء میں منظر عام پر آنے والے ''افکارِ عالیہ'' میں اپنے رشحات قلم سے تھوڑا بہت پیش کرکے ان لوگوں کا منھ بند کردیا جو یہ کہا کرتے تھے کہ حساب کتاب لکھتے لکھتے ان کے قلم کی روشنائی خشک ہوگئی ہے۔ وہ ''افکارِ عالیہ'' کے مدیر اعلیٰ تھے، ان کے نام نے اس رسالے کو وقعت اور اعتبار عطا کیا تھا۔ ادھر وہ کافی دنوں سے معذور تھے اور مجلّے کے امور زیادہ تر استادِ محترم مولانا عبداللطیف اثری انجام دیتے تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے تدریس میں قابل رشک مہارت کے ساتھ صحافت کا اچھا ذوق بھی عطا کیا ہے اور اب تو مکتبہ الفہیم (مئو) نے ان کو ایک محقق کی حیثیت سے بھی متعارف کرا دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو تادیر سلامت رکھے اور نئی نسل کو ان سے استفادہ کرنے کی توفیق بخشے، آمین۔

''افکارِ عالیہ'' کا پہلا شمارہ منظر عام پر آیا تو ابن احمد نقوی صاحب نے اداریہ ملاحظہ کرنے کے بعد کہا کہ لگتا ہے کہ کسی نے مولانا آزاد کے ''تذکرہ'' کا ورق کھول کر رکھ دیا ہے۔

جامعہ عالیہ کی انجمن تہذیب البیان اپنی کارکردگی اور نشاطات کے لحاظ سے شہر کی سب سے متحرک انجمن تھی۔ ۸۰ اور ۹۰ کی دہائی میں مضمون نگاری کی جو سرگرمیاں عالیہ میں نظر آتی تھیں، مئو کے اکثر مدرسے اس سے محروم تھے۔ ہفتہ واری تقریری پروگرام کے ساتھ انشا وصحافت کا ایک ماحول تھا، روح رواں اور رہبر مجاز صاحب تھے۔ طلباء کا مجلّہ ''تہذیب'' غالباً شہر کا سب سے پرانا طلباء مجلّہ ہے۔ اب تک جتنے لوگ انجمن اور مجلّے کی ذمے داری سے وابستہ رہ چکے ہیں وہ اس

باب میں مجاز صاحب کی قربانی اور صلاحیت کا اعتراف کریں گے۔
مجلّے کی ترتیب میں جو حسن اور سلیقہ نظر آتا ہے وہ انھی کی دین ہے۔ ہر سال ان کی کوشش سے ہماری لفظیات میں اضافہ ہوتا تھا۔ مجلّے میں ناظم جامعہ کے نام سے شائع ہونے والے تأثرات مجاز صاحب ہی لکھتے تھے۔ اس سالانہ تحریر میں بھی ہمیشہ لفظیات اور معنویت کی سطح پر جدت اور ندرت ہوتی تھی۔ ''تہذیب'' کا پہلا اداریہ ''نمودِ سحر'' کے عنوان سے آپ ہی کے زرنگار قلم کی دین ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ گزشتہ دو دہائی کے اندر جو نئے لکھنے والے ابھرے ہیں ان میں عالیہ کے فاضلین کی تعداد قابل ذکر ہے اور ان میں سے کوئی بھی اس بات کا دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اس نے اس میدان میں مجاز صاحب سے استفادہ نہیں کیا ہے۔ کتنے بے ڈھنگوں کو ان کی صحبت نے قلم کار بنا دیا۔

میں نے مجاز صاحب سے کلاس سے باہر زیادہ استفادہ کیا ہے اور اگر آج مجھ کو تھوڑا بہت جو لکھنا آتا ہے تو اس میں ان کی تربیت کا اہم کردار ہے۔ مجھے درسیات سے دلچسپی کم تھی اور ادبی کتابوں کے مطالعے کا شوق زیادہ۔ مطالعے کے دوران مشکل الفاظ وعبارات اور فارسی کی ادق تعبیرات ایک کاغذ پر نوٹ کرلیتا اور فرصت کے اوقات میں ان کے پاس بیٹھ کر ایک ایک لفظ حل کرتا تھا۔ کبھی کبھی میری نادانی پر ناراض ہوجاتے تھے لیکن ان کا غصہ سطحِ آب پر حباب کی مانند بہت جلد فرو ہوجاتا تھا۔ میری کتنی بے ربط اور اوٹ پٹی تحریروں کو ان کے زرنگار قلم کی جنبش نے چمکا دیا۔ انجمن تہذیب البیان کی ذمے داریوں سے وابستہ ہونے کے بعد ان سے بہت قریب ہوگیا۔ انجمن سے تعلق کی بنا پر کچھ نئے تجربات تو ضرور ہوئے لیکن اس دوران مجاز صاحب سے تحریر وانشا کے میدان میں جو کچھ حاصل کیا دراصل وہی ''حاصلات عالیہ'' ہیں۔ انجمن کا ایک تعارف لکھ کر ان کے پاس پہنچا اور ذرا نادر قسم کا عنوان لگانے کی گزارش کی۔ انھوں نے ''رود سلسبیل ...... فی جنۃ عالیۃ'' کا عنوان لگا کر میری حوصلہ افزائی کی۔ ان کے پاس الفاظ وتراکیب کی کمی نہیں تھی۔ ان کا ہر عنوان قاری کو چونکا دیتا تھا۔ وہ برجستہ لکھتے تھے اور خوب لکھتے تھے۔

یادش بہ خیر! ۱۹۹۲ء میں جب ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری کو عربی زبان وادب کی خدمت پر صدر جمہوریہ ایوارڈ سے نوازا گیا تو جامعہ عالیہ نے ان کے اعزاز میں ایک تقریب کا انعقاد کیا۔ بہت ہی شارٹ نوٹس پر ہونے والے اس پروگرام میں مجاز صاحب نے ازہری صاحب کا ایک مختصر تعارف لکھا تھا جو اسی مجلس میں پڑھا گیا تھا۔ ان کی یہ تحریر زبان وادب کا اعلیٰ شاہ کار تھی۔ فارسی تراکیب اور استعارے کی مدد سے انھوں نے کاغذ پر جو گل بوٹے کھلائے تھے اس پر کشت زعفران کا گمان ہوتا تھا۔ اس وقت مجھ کو اس تحریر کے ایک آدھ جملے ہی یاد آرہے ہیں جن میں انھوں نے ازہری صاحب کے لیے ''علم کا شاہین'' کی ترکیب استعمال کی تھی۔ اگر اس تحریر کو افکار عالیہ میں شائع کردیا جائے تو ازہری اور مجاز دونوں کے لیے خراجِ تحسین ہوگا۔

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد سے ان کو عقیدت تھی۔ دہلی میں قیام کے دوران ایک بار ان کو دیکھا بھی تھا۔ ان کی تحریروں کو خوب خوب پڑھا تھا۔ ''تذکرہ'' کا ایک پرانا نسخہ، جو چھوٹی تقطیع پر چھپا تھا، ان کے پاس تھا اور اس کو بہت ہی سینت کر رکھتے تھے۔ ان کی عبقریت، دوراندیشی، بے لوثی اور بے داغ سیاسی زندگی کا ذکر کیا کرتے تھے۔ ان کی علمیت کے ساتھ ان کے سیاسی خیالات کے بھی حامی تھے۔ مسلم لیگ کی سیاست نے کبھی ان کو متاثر نہیں کیا۔ دوقومی نظریے کے شدید خلاف تھے اور مسلم لیگ کی سیاست کو ہندوستانی مسلمانوں کے لیے خطرناک سمجھتے تھے۔ لیکن کانگریس کے اس گروپ پر بھی تنقید کرتے تھے جس نے فرقہ پرستانہ سیاست کو بڑھاوا دیا اور اردو کی مخالفت کی۔ پاکستان کی سیاسی حالت پر ان کا تبصرہ بڑا زہرناک ہوا کرتا تھا۔

نثر نگاری کے ساتھ شعر میں بھی ان کے پاس اچھا خاصا سرمایہ موجود ہے۔ انھوں نے نظمیں کہیں، رباعیات وقطعات بھی اور چند غزلیں بھی۔ اردو کے ساتھ عربی اور فارسی میں بھی ان کی کچھ تخلیقات موجود ہیں جن سے شعر وشاعری کے میدان میں بھی ان کی صلاحیت

کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے شخصیات کی وفات پر خوب نظمیں لکھیں جیسے علامہ ثناء اللہ امرتسری، مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی، حافظ حمید اللہ دہلوی، شیخ الحدیث مولانا عبید اللہ رحمانی مبارک پوری، مولانا محمد احمد ناظم (سابق ناظم جامعہ فیض عام، مئو)، مولانا عبدالوحید سلفی (سابق ناظم جامعہ سلفیہ، بنارس)، ماسٹر نثار احمد انصاری (سابق ناظم جامعہ عالیہ عربیہ، مئو)۔ ان نظموں میں ان شخصیات کے تئیں ان کے جذبات کا اظہار ہوتا ہے اور ان کے کام اور کارناموں سے متعلق ان کی رائے کا بھی۔ شخصیات کے علاوہ مختلف موضوعات جیسے تاریخ اہل حدیث، لیلۃ القدر، مجرمین دیوبند اور ضرورت خلیل کے عنوان سے بھی ان کی فکر انگیز نظمیں ہیں۔ اپنی اہلیہ زہرہ خاتون کی وفات (۱۹۸۹ء) پر ایک دردانگیز مرثیہ لکھا تھا جو سوز اور سادگی کا بہترین مرقع ہے۔

میں نے سب سے پہلے مجاز صاحب کا کلام اپنی والدہ محترمہ کی زبانی سنا، جن کا ادبی ذوق ان کی معاصر خواتین میں قابل رشک ہے۔ مکتبی تعلیم کی کمی کے باوجود بھی اسلامیات وادب کا مطالعہ موٹی موٹی تنخواہیں وصول کرنے والی بے مغز معلّمات سے بہتر۔ حافظہ اگر وفا کررہا ہے تو ''لیلۃ القدر'' اور حافظ حمید اللہ پر ان کی نظمیں بچپن میں بارہا والدہ کی زبانی سنیں۔

مجاز صاحب شعر کہتے تھے اور برجستہ اور برمحل۔ متنبّی، معری، عرفی، سعدی، حافظ، میر، غالب اور اقبال کے اشعار بھی سنایا کرتے تھے۔ دہلی سے جاتا تو ان سے ملنے کے لیے جامعہ جاتا تھا۔ جب بیماری اور درازیِ عمر کے باعث مدرسے آنا جانا بند ہوگیا تو میں ان کے گھر حاضر ہوتا تھا اور کبھی کبھی گھر کے باہر ایک دکان پر مل جاتے تھے اور وہیں علم کا دفتر کھل جاتا تھا۔ ادب اور شعر کے کتنے نکات جو جدید دانش گاہوں کے کلاس روم میں حل نہیں ہوپاتے تھے سڑک پر بات چیت کے دوران وہ ایسے حل کردیتے تھے کہ ایک خوش گوار حیرت کا احساس ہوتا تھا۔ میں مئو میں تھا، ۱۸ر ستمبر ۲۰۱۰ء کو ملاقات کے لیے حاضر ہوا، خیریت دریافت کی تو اپنی دو رباعیوں میں پوری کہانی سنا ڈالی۔ لیجیے آپ بھی سنیے اور ان کی ذہانت اور برجستہ گوئی کی داد دیجیے ؎

خالی متاعِ زیست سے جب ظرف ہوگیا
تحلیل آہِ سرد میں ہر حرف ہوگیا
اب گرمی حیات کا کیا خواب دیکھنا
جو دل کہ پہلے دل تھا وہی برف ہوگیا

یوں چلوں سرخم کیے جیسے عمر رفتہ کی تلاش
آگے بڑھتا جاؤں میں اس سے دور ہوتا جاؤں میں
میرے چہرے کی لکیروں پر حروف آخریں
سب پڑھیں، پڑھنے سے خود معذور ہوتا جاؤں میں

مجاز صاحب کی شاعری کے نمونے مختلف رسائل وجرائد میں بکھرے ہوئے ہیں اور اچھا خاصا کلام ابھی تک غیر مطبوع ہے لیکن ان کے پاس محفوظ ہے۔ عزیزم طاہر جمال سلمہ، جنھوں نے مجاز صاحب کی حیات وخدمات پر مقالہ لکھا ہے، نے کلامِ مجاز کو مختلف رسائل وجرائد سے نقل کرکے جمع کیا ہے۔ اللہ کرے جلد از جلد اس کی اشاعت کا سامان ہوجائے۔ مجاز صاحب تو اپنے حصے کی زندگی جی کر چلے گئے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ نئی نسل ان کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہے۔ ہم لوگ اپنے محسنوں کی خدمات کے تعارف میں جس بخل کا مظاہرہ کرتے آرہے ہیں اس کو دیکھتے ہوئے تو طرح طرح کے اندیشے پیدا ہورہے ہیں۔ فضا ابن فیضی، ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری اور مجاز اعظمی کے درمیان فرق مراتب کے باوجود کچھ چیزیں مشترک تھیں۔ اب تینوں حضرات اس دنیا میں نہیں ہیں۔ فضا صاحب تو زندگی بھر ناقدریِ فن کا شکوہ کرتے رہے اور ایسا نہیں کہ بے جا ہی کرتے رہے۔ اپنوں نے بھی ان کو نظر انداز کیا۔ اس وقت میرے سامنے جامعہ عالیہ عربیہ، مئو کی جنتری (۲۰۱۱-۱۲ء) ہے جس میں فضا ابن فیضی کی تین تخلیقات حمد (ص:۲)، نعت (ص:۳) اور ترانۂ جامعہ (ص:۱۲،۱۳) موجود ہیں اور کسی جگہ ان کا نام نہیں لکھا گیا۔ ہوسکتا ہے اپنے محسنوں کو یاد کرنے کا یہ بھی ایک طریقہ ہو لیکن میں ابھی اس سے

آشنا نہیں ہوں۔ ازہری صاحب جب تک جیے اخلاص اور دیانت کے ساتھ جامعہ سلفیہ کی خدمت کی اور دوسرے بہت سے اداروں اور افراد کے ساتھ اہل مئو نے بھی ان کی صلاحیت، علم، رسائی اور رسوخ سے فائدہ اٹھایا۔لیکن ان کی یاد میں خصوصی شمارے بنارس یا مئو سے نہیں، کرشنا نگر، کپل وستو، نیپال (نور توحید: نومبر، دسمبر ۲۰۰۹ء) اور جھنڈا نگر، نیپال (السراج، اپریل تا جولائی ۲۰۱۰ء) سے شائع ہوئے۔ برادرم مکرم اسعد اعظمی استاذ جامعہ سلفیہ (بنارس) مبارک باد کے مستحق ہیں جنھوں نے جامعہ سلفیہ (بنارس) میں طاہر جمال کو مجاز صاحب پر مقالہ لکھنے کا مشورہ دیا اور خود اس کی نگرانی بھی فرمائی جس کی وجہ سے ان کی زندگی کے کئی گوشے سامنے آگئے ہیں۔ میں اپنا مضمون سمیٹ رہا تھا کہ مئو سے استاذ محترم مولانا عبدالرحمٰن عالی (صدر شعبۂ فارسی، جامعہ عالیہ عربیہ) کا فون آیا اور انھوں نے مجاز صاحب کی زندگی سے متعلق کچھ اہم باتیں بتا کر میری معلومات میں اضافہ کیا اور کچھ اصلاح بھی جو ان کے شکریے کے ساتھ اس مضمون میں شامل ہیں۔

ڈاکٹر رضاء اللہ مبارک پوری، فضا ابن فیضی اور ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری کے بعد اب مجاز صاحب بھی رخصت ہوگئے جو میرے مربی اور محسن تھے۔ آج میں اردو میں جو کچھ بھی لکھ لیتا ہوں اس میں ان کی تربیت کا بہت دخل ہے۔ ان کے بعد تو اب اندھیرا ہے اور بڑا وحشت ناک اندھیرا۔علم وثقافت کی وادی قدر آور شخصیات سے خالی ہوتی جارہی ہے۔مجاز صاحب کی وفات سے اردو زبان ایک اچھے نثر نگار سے محروم ہوگئی ہے۔ان کی صحافتی زندگی کی جو اُٹھان تھی اگر وہ جاری رہتی تو آج منظر نامہ کچھ اور ہی ہوتا۔ ہمارے عہد کا اس سے بڑا المیہ کیا ہوسکتا ہے کہ جس قلم سے قوموں کی تقدیر لکھی جاتی ہے، ہم نے اس کو گوشوارۂ آمد وخرچ تحریر کرنے تک محدود کر دیا تھا۔ یہ ایک روح فرسا علمی سانحہ ہے اور ادبی زوال کی بدترین مثال۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ یہ زوال مائل بہ عروج ہے۔



ضرورت مدرس

جامعہ محمدیہ اہل حدیث جام پور میں تدریسی خدمات کے لیے اچھے، تجربہ کار، شریف الطبع مدرس کی ضرورت ہے۔ جو طلباء کو تجوید کے ساتھ حفظ وناظرہ قرآنِ مجید پڑھانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

تنخواہ حسب لیاقت دی جائے گی۔ ان شاء اللہ

آنے سے پہلے فون پر رابطہ کیا جائے۔

محمد یٰسین راہی، مہتمم جامعہ محمدیہ اہل حدیث جام پور

فون: 0333-8556473

دعائے مغفرت

①......حکیم عبداللطیف انصاری توحید آباد (بت) ۶۴ برس کی عمر میں ۲۶ جولائی ۲۰۱۲ء کو وفات پا گئے۔

②......مولانا علاء اللہ اور مولانا عنایت اللہ امین کی ممانی صاحبہ گزشتہ دنوں وفات پا گئیں۔ احباب مرحومین کی مغفرت کے لیے دعا کریں۔ (محمد یحیٰ عزیز ڈاھروی)

صدقہ جاریہ

دارالدعوۃ السّلفیہ (لاہور) جیسے علمی وتحقیقی اور دینی ادارے میں جگہ کی تنگی کے باعث کارکنان کے لیے رہائشی سہولت کی خاطر چند کمرے تعمیر کرنے کی اشد ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ مخیرّ احباب ایک ایک کمرے کے لیے یا کچھ احباب مل کر اگر تعمیر میں تعاون کرنا چاہیں تو یہ ایک صدقہ جاریہ ہے۔

جو احباب تعاون کرنا چاہیں جلد رابطہ فرمائیں۔ اس فنڈ میں جمع ہونے والی رقم صرف اسی مد میں استعمال ہوگی۔ إن شاء الله

تعاون کرتے وقت تعمیری فنڈ کا تذکرہ فرما دیں۔ جزاکم الله خیرا

مجلس عاملہ دارالدعوۃ السّلفیہ، شیش محل روڈ، لاہور

کرنٹ اکاؤنٹ نمبر: 2-0335-262-01، الائیڈ بنک، بلال گنج برانچ، لاہور

روزہ

اخلاق کے ایوان کی تعمیر ہے روزہ
بنیادِ خرافات کی تدمیر ہے روزہ

جس میں نہ ریا ہے نہ کوئی مکر نہ دھوکا
اُس حسنِ عبادت کی یہ تصویر ہے روزہ

شیطان تو انسان کا دشمن ہے پرانا
شیطان کا زندان ہے زنجیر ہے روزہ

وہ روح کا ہو یا کہ مرض ہو وہ جسد کا
ہر ایک مرض کے لیے اکسیر ہے روزہ

جو دل کہ مچلتا ہے گناہوں پہ ہمیشہ
اُس دل کے لیے نسخہ تسخیر ہے روزہ

روزہ سے ضیا ملتی ہے قلب اور نظر کو
مومن کے لیے چشمہ تنویر ہے روزہ

کافی ہے وہ روزے کے فضائل کی ضمانت
جس شان سے قرآن میں تحریر ہے روزہ

جس نفس کی اصلاح کا امکان نہ ہو عاجزؔ
اُس نفس کی اصلاح کی تدبیر ہے روزہ

(عبدالرحمٰن عاجزؔ، مالیرکوٹلوی)